ستمبر ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

جلد ۱۱۹ ستمبر ۱۹۹۳ عدد ۹

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ :

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مُختصر حواشی

***

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جِلد میں

تفہیمُ القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳ × ۳۶ / ۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ھدیہ: -/۱۷۵ روپے

إدارہ ترجمانُ القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار لاہور

فون: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۷۰ - ۵۴۴۰

ماہنامہ

ترجمان القرآن

لاہور

جلد ۱۱۹ — عدد ۹

ستمبر ۱۹۹۳ء ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

فہرست مضامین

اشارات	خرم مراد	۳
حکمت مودودیؒ — دستور جماعت کی اہم بنیادیں		۱۳
اغیار کا اعتراف	علامہ راشد الخیری	۱۶
انک لعلی خلق عظیم	ڈاکٹر آصف قدوائی	۲۱
الدعاء	محمد تاثیر	۲۹
رسائل و مسائل	مولانا عبدالمالک	۳۹
ولوکان بالصین ' ویران مسجد کا انہدام ' جہیز کی مسنون صورت		
مطبوعات		۴۲

برائے ادارتی امور: منصورہ 'ملتان روڈ' لاہور ۵۴۵۷۰ 'فون نمبر ۷۵۷۰۱۴۴-۸ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ 'اردو بازار' لاہور ۵۴۰۰۰ 'فون نمبر ۷۲۳۴۰۴۳-۷۲۳۶۲۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ مینیجر ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۶ روپے ○ زر سالانہ: ۶۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک 'خلیجی امارات و برصغیر: ۲۰ ڈالر یورپ: ۲۵ ڈالر امریکہ و آسٹریلیا: ۲۵ ڈالر

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز' لاہور سے چھپوا کر دفتر' ترجمان القرآن' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

وطنِ عزیز ایک عرصہ سے جس سنگین بحران سے گزر رہا ہے' وہ اب انتخابات کے مرحلہ میں داخل ہو کر بظاہر پر سکون ہوگیا ہے۔ لیکن' جیسا ہم گذشتہ شمارہ (اگست' ۹۳) میں لکھ چکے ہیں' ہم جب بھی

> کسی بحران سے نکلے' تو اس طرح کہ اسباب کا کچھ ازالہ نہ ہوا۔ ہاں' مارشل لا اور ناقص یا مصنوعی انتخابات جیسی تدابیر سے حالات کو پر سکون کر دیا گیا۔۔۔۔ جب تک یہ سطور آپ تک پہنچیں گی غالباً ایک دفعہ پھر کوئی نہ کوئی مصنوعی تدابیر اختیار کی جا چکی ہوں گی' کیونکہ حقیقی حل کے لیے قدم اٹھانے کو اب بھی کوئی تیار نہیں۔

چنانچہ بالکل یہی ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں کوئی حقیقی حل تو کردار کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں' لیکن سب سے بہتر راستہ' اب بھی ہماری نظر میں' وہی تھا جو ہم نے تجویز کیا تھا۔ یعنی' ملک کے تینوں مقتدر (فوج + صدر + وزیراعظم)' دیگر سیاسی قوتوں کے اتفاق کے ساتھ' انتخابات کے عمل کو منصفانہ بنانے اور آمریت اور بدعنوانیوں کا راستہ بند کرنے کے لیے مستقل انتظامات کو بروئے کار لاتے' اور منتخب حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے کی مہلت دیتے' یا اس سے پیشتر ہی انتخابات کے لیے کسی مناسب تاریخ پر اتفاق کرلیتے۔ اس طرح قوم فوری مصنوعی انتخابات کے بخار اور اس کے بعد رونما ہونے والے متوقع ناخوشگوار نتائج سے بچ سکتی تھی۔

ملک کی اصل قوتِ قاہرہ چاہتی تو ایسا ہونا بالکل ممکن تھا۔ بلکہ' اگر وہ مرکزی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر اپنا فرضِ منصبی ہی ادا کرتی' تو منتخب حکومت' کسی متفقہ فارمولے کے بغیر بھی' اپنی مدت پوری کر سکتی تھی۔ اس نے ان دونوں میں سے کوئی راہ بھی اختیار کرنا کیوں پسند نہ کیا؟ یہ بڑا اہم اور دلچسپ سوال ہے۔ لیکن شاید اب' پاکستان کی قومی زندگی کے دیگر اہم

سوالات کی طرح یہ بھی ایک لانیحل معمہ کی طرح تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔ ہم اس بارہ میں قیاس آرائی کرسکتے تھے' لیکن یہ وقت اس کے لیے مناسب نہیں۔

جب صحیح راستہ اختیار نہ کیا گیا تو سب سے کم نقصان وہ راستہ فوری انتخابات ہی کا رہ گیا تھا۔ اگرچہ جیسا ہم نے لکھا تھا "ہر حل میں خرابی کی صورت مضمر ہے" اور "انتخابات سے مسئلہ حل تو نہ ہوگا۔" لیکن کوئی اور چارہ کار اس لیے نہیں تھا کہ "نہ کرانے کی صورت میں حالات بدتر ہوسکتے ہیں"۔ تعجب یہ ضرور ہے کہ فارمولے پر اتفاق کراتے ہوئے ان ممکنہ اصلاحات کے بارہ میں بھی نہیں سوچا گیا جن سے انتخابات کے نتائج بہتر حاصل کیے جا سکتے تھے۔ یہ شاید اس لیے کہ قوم کو فوری انتخابات میں مبتلا کرنے والے اس سے بہتر کوئی نتیجہ حاصل کرنا نہیں چاہتے کہ وہی لوگ اوپر آئیں جو اب تک کبھی نہ کبھی برسراقتدار رہے ہیں' یا شاید ترجیح اس کو ہو کہ موجودہ ٹولہ بدل جائے۔ لیکن جو بھی آئے اس کو جمہوری جواز حاصل ہو' اور وہ ان کی مرضی کا کام کرے۔ اور ان کاموں میں سرفہرست یقیناً امریکہ سے قدیم فدویانہ تعلقات کی استواری ہے۔ اور اس کی قیمت کے طور پر سیاسی نظام میں تبدیلی' دستور کا خاتمہ' ہوم فرنٹ پر بنیاد پرستی کا ازالہ' خارجہ پالیسی میں اسرائیل اور بھارت سے مفاہمت اور وسط ایشیا سے اجتناب' ---جو کچھ جتنا بھی حاصل کیا جاسکے۔

آج ہم عرصۂ محشر میں ہیں۔ جب عالمی سطح پر دم بدم انقلاب انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں' عالم پیر الٹ پلٹ ہو رہا ہے' جن کو کارِ جہاں سے غرض ہے وہ تو دور کی سوچ رہے ہیں اور اپنے سارے پیمانے اور اندازے بدل چکے ہیں۔ لیکن یہ اپنی بدقسمتی محسوس ہوتی ہے کہ وہ جو ایک جہانِ نو کے داعی اور علمبردار ہیں' سب انقلابات سے غافل' نصف صدی قبل کے پیمانے لے کر آنے والے انتخابات میں برسرپیکار مختلف قوتوں کو ناپنے تولنے اور اپنی پسندیدہ حکمتِ عملی متعین کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ پیمانے جو اب فرسودہ اور حقیقت سے دور ہو چکے ہیں۔ وہ اب بھی دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کو حقیقت سمجھ کر برقرار رکھنے پر مصر ہیں' حالانکہ یہ تفریق اب اپنے معنی کھوچکی ہے۔ وہ پھر سے یہی سوچ رہے ہیں کہ چھوٹی برائی کے پلڑے میں انقلابِ اسلامی کی علمبردار قوتوں کو پہلے کی طرح اپنا وزن ڈال دینا چاہیے تاکہ نیکی کے غلبہ کی راہ ہموار ہوسکے' حالانکہ اب چھوٹی اور بڑی برائی کے درمیان فرق بڑی طاقتور خوردبین کی مدد سے ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس نے آنے والے انتخابات میں تحریکِ اسلامی کو ایک مشکل اور نازک صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔ اس صورتِ حال سے ایسی حکمت اور نظر سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے کہ نقصان کم سے کم ہو' اور نفع زیادہ سے زیادہ۔ اس غرض کے لیے اہلِ قافلہ کو کم از کم حقائق کا صحیح ادراک ضرور ہونا چاہیے۔

ایک طرف تحریک کا وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے وہ نصف صدی سے کوشاں ہے۔ یعنی زمامِ کار میں تبدیلی آئے' بھلائی اور نیکی کی حامل قوتیں اوپر آئیں' اور دین کو غلبہ حاصل ہو۔ اس کے ساتھ تاریخی اور تہذیبی تغیرات کا چیلنج ہے' جو تقاضا کر رہا ہے کہ "جو ہے وہ نہ رہے" اور عصرِ حاضر نے جس شرعِ پیغمبرؐ کی نمود کو قریب تر کر دیا ہے' وہ شرعِ پیغمبرؐ آشکار کی جائے۔ پاکستان کے خلاف عالمی طاقتوں کی یلغار ہے' ان کے منصوبے اور ریشہ دوانیاں ہیں' اس خطہ کے لیے ان کے سوچے سمجھے نقشے ہیں' بھارت اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ ہے' (انہی کا ایک حصہ یہ انتخابات بھی ہیں)' جن کا مقابلہ پوری ہمت' حوصلہ' جوانمردی اور فراست و تدبر سے کرنا ضروری ہے۔ ملک کے اندر ضعف' اخلاقی انحطاط' ظلم و فساد' معاشی ناہمواریاں' مجموعی افتراق و انتشار اور مقتدر قوتوں کی باہمی آویزش ہیں' جن کے ازالہ کے لیے اخلاص کے ساتھ صحیح خطوط پر کوشش ناگزیر ہے۔ یہ سارے چیلنج اور مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ عامتہ المسلمین میں جتنا خیر جہاں بھی پایا جاتا ہو' تحریک اس کو یکجا اور منظم کرے' اس کو ایک متبادل قوت بنائے' کسی چھوٹی بڑی برائی کے بجائے خیر کی مجموعی قوت کو غالب کرنے کے لیے ایک مناسب حکمتِ عملی اختیار کرے' اور اس قوت کی کامیابی کے لیے اپنی ساری قوتیں کھپا دے۔ ایسی حکمتِ عملی کی طرف رہنمائی کے لیے ہی ہم نے جنوری کے شمارہ میں سیّد مودودیؒ کے افکار کا خلاصہ پیش کیا تھا' اور ان کی روشنی میں اس سلسلہ میں چند خطوط کی نشان دہی بھی کی تھی۔

تحریک نے ابھی ایسی حکمتِ عملی کی سمت میں ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ ملک کو انتخابات میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مستقل حکمتِ عملی پیش رفت کے لیے وقت چاہتی ہے' اور انتخابات سر پر کھڑے ہیں۔ لیکن فوری انتخابات کے دباؤ کے تحت کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنا جو اس مستقل حکمتِ عملی کی بساط لپیٹ دے' یا اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے' اپنے اصل مقصد کے حصول' وقت کے چیلنج اور ملک و ملت کے مفاد سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔

دوسری طرف' ان انتخابات کے نتائج ملک کے لیے' اور تحریک کے لیے بھی' اہم ثابت ہوسکتے ہیں۔ اور تحریک جو انتخابی پالیسی اختیار کرے گی' اس کے جو اثرات ان نتائج پر پڑ سکتے

ہیں وہ بھی اہم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے آنے والے انتخابات کے نتائج سے بالکل صرفِ نظر کر کے صرف مستقل حکمتِ عملی ہی پر کاربند رہنا بھی دانش مندی پر مبنی نہ ہوگا۔

اگرچہ صرف ان انتخابات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی پالیسی بناتے ہوئے' اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے کے' خصوصاً ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ کے' انتخابات نے کوئی ایسے نتائج پیدا نہیں کیے جن سے ملک و ملت کی بہتری ہوتی' حتیٰ کہ جمہوریت کی گاڑی بھی پٹڑی سے نہ لگ سکی۔ تحریک نے بھی جن نتائج کی توقع میں اتحاد میں شرکت کی پالیسی اختیار کی' اس سے کوئی قابلِ ذکر نتائج مرتب نہ ہوئے۔ نہ نفاذِ شریعت کے لیے' نہ ملک و ملت کے لیے۔ نہ مطلوبہ مقاصد کی طرف کوئی پیش رفت ہوئی۔

اب تک کے حالات یہی بتاتے ہیں کہ آنے والے انتخابات میں بڑا معرکہ پیپلزپارٹی' اور اینٹی (مخالف) پیپلزپارٹی' پارٹی کے درمیان ہوگا۔ یعنی' محترمہ بے نظیر اور جناب نواز شریف کے درمیان۔ اگرچہ پس پشت قوتوں کی سوچ یہ لگتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ کرسکے' لیکن جب ایک دفعہ انتخابات کی بینڈ ویگن رواں ہوجاتی ہے اور معرکہ گرم ہو جاتا ہے' تو نتائج کا ان قوتوں کے کنٹرول میں رہنا یقینی نہیں رہتا اور یہ ان کی مرضی کے خلاف بھی نکل سکتے ہیں۔

جب ۱۹۷۰ سے آج تک کے سارے انتخابات پیپلزپارٹی کے محور پر ہی لڑے جاتے رہے ہیں' اور اب تک کی تحریک کی انتخابی پالیسی میں اسی عامل کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے' تو آج بھی لوگوں کا یہ اصرار قابلِ فہم ہے کہ تحریک اپنا وزن پیپلزپارٹی کے خلاف' یعنی جناب نواز شریف کے ساتھ' ڈالے۔ وہ برے سہی' لیکن بہرحال چھوٹی برائی ہیں' اور بڑی برائی کی راہ روکنے کے لیے اس چھوٹی برائی کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ یہ بات بھی بالکل بے وزن نہیں کہ' بصورت دیگر' پیپلزپارٹی کا پلڑا بھاری ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا نقطہ نظر یہی ہے کہ سیاست اور انتخابات کی حیثیت ایک جنگ کی سی ہے۔ جنگ میں تدبیر کی نوعیت اصول کی نہیں ہوتی' اِلّا یہ کہ اس سے کسی حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ حدودِ الٰہی کے اندر' جس تدبیر سے اپنی منزل کی طرف پیش رفت ہوسکتی ہو' وہ تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے سیاست میں تحریک کوئی دروازہ بند نہیں کرسکتی' کسی سے بھی معاملہ کرسکتی ہے' کسی سے بھی حلیفانہ تعلقات استوار کرسکتی ہے' کہ ایسا کرنا ناجائز نہیں۔

جناب نواز شریف کے ماضی کے کردار سے عدم اطمینان کے باوجود ان کے ساتھ بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس سے بھی معاملہ کیا جائے اس کے مقام کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ اور جو معاملہ کیا جائے اس کے بارہ میں صحیح اندازہ ضروری ہے کہ کیا پائیں گے اور کیا کھوئیں گے' اور جو پائیں گے وہ نقصان سے زیادہ ہوگا۔

پیپلزپارٹی کو شکست دینے کے لیے ان کا ساتھ دینا ہو' تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کیاان کا ساتھ دے کر یہ ہدف حاصل ہوگا؟ اس بات سے تو اب ان کے حما-تیوں کو بھی اتفاق ہے کہ وہ ایک برائی ہیں۔ ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ ایک کم تر برائی ہیں۔ چھوٹی برائی کے طور پر ان کو قبول کرنا ہو' تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے برسراقتدار آنے سے جو برائی آئے گی کیا بھلائی اس پر غالب ہوگی؟

اس سلسلہ میں چند باتیں سامنے رکھنا ضروری ہے'

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ کیا وہ اب تک پیپلزپارٹی کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں' جو اس مقصد کے لیے آئندہ کے لیے بھی ان پر اعتماد کیا جائے' اور ان کا ساتھ دیا جائے؟ ۱۹۹۰ کے انتخابات میں ان کی سربراہی میں اسلامی جمہوری اتحاد نے پیپلزپارٹی کو شکست دی' بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی' پارلیمنٹ میں ان کو دو تہائی حمایت حاصل ہوگئی' اور انہوں نے ایک بڑی مستحکم حکومت بنالی۔ یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ شمار ہوسکتا ہے' اگرچہ اس بات سے بھی انکار کرنا مشکل ہوگا کہ یہ کارنامہ سرزد نہ ہوتا اگر ان کو فوج اور صدر کی مکمل پشت پناہی حاصل نہ ہوتی' اور نگراں حکمراں' خصوصاً جام صادق' وہ ہتھکنڈے استعمال نہ کرتے جو انہوں نے کیے۔

لیکن ان کا اصل امتحان تو یہ تھا کہ وہ انتخابات کے بعد پیپلزپارٹی کو اسی مقام پر رکھتے جس مقام پر اسے انتخاب میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس امتحان میں ان کی مکمل ناکامی بالکل عیاں ہے۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں انہوں نے پشت پناہ قوتوں کی حمایت کھو دی' حلیفوں کو ضائع کر دیا' پیپلزپارٹی کا سائز بڑھا دیا' اور قوم کو ایک دفعہ پھر ایسے انتخابات میں لاکر ڈال دیا جن میں اصل مدمقابل پھر پیپلزپارٹی ہی ہے۔ اب اس مقابلہ کی دہائی دے کر ان کے زخم خوردہ حلیفوں پر دباؤ ڈالنا کہ وہ ان کے دست و بازو بن جائیں کہاں تک معقول ہوسکتا ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ پھر ایسے ہی "چوتے اور چھکے" ماریں' اور پھر اسی طرح آؤٹ ہوں؟

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیپلزپارٹی سے ان کی جنگ اقتدار کی جنگ ہے' اصولوں اور پالیسی و پروگرام کی نہیں۔ امریکہ کے اشارہ پر فوج اور حساس اداروں میں جو تبدیلیاں وہ لائے'

انہوں نے بھی ان کو برقرار رکھا۔ تعلیمی پالیسی جو اس نے بنائی' سرورق تبدیل کر کے انہوں نے بھی وہی نافذ کردی۔ ساچی اینڈ ساچی کی بدنامِ زمانہ یہودی کمپنی کو اس نے اپنا ایجنٹ مقرر کیا ہے' انہوں نے بھی اسے ہی پسند کیا۔ میڈیا دونوں کے دور میں یکساں طور پر عریانی' اخلاق باختگی اور ہماری ایمانی و تہذیبی بنیادوں کی بیخ کنی کا کام ہی کرتا رہا۔ جو معاشی پالیسیاں انہوں نے بنائیں' پیپلزپارٹی کے نگراں وزیر خزانہ نے انہیں من و عن برقرار رکھا۔

یہ اداروں کے استحکام کی خاطر تو پیپلزپارٹی سے بحیثیت حزبِ اختلاف معاملہ کرنے پر تیار نہ ہوئے' جو ہماری نظر میں انہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہاں' صدر اسحق خاں کے اختیارات خود حاصل کرنے کے لیے آٹھویں ترمیم کے معاملہ پر اس کی حمایت کی ضرورت پڑی' تو انہیں اسے وزارتوں کی پیشکش کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ اگر وہ خود ہی صدر کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہ کرتی' تو یہ بھی آصف زرداری کو وزیر بنا لیتے۔ اب اگر پیپلزپارٹی کو شکست دینے کے لیے ان کا ساتھ دیا جائے' تو کیا یہ سوچنا ضروری نہیں کہ کل' اپنے اقتدار کے لیے ضروری ہوا' تو کہیں وہ خود تو اسے گلے نہ لگالیں گے؟

۳۔ تیسری بات سوچنے کی یہ ہے کہ اگر یہ چھوٹی برائی ہیں تو کتنی چھوٹی برائی ہیں؟ اور اگر ان کو وزیراعظم بنانے کے لیے تحریک نے ان کا بھرپور ساتھ دیا' تو اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے ہمیں کل کیا کچھ دیکھنے کو ملے گا؟ عام آدمی کی عزتِ نفس' اور فلاح و بہبود کی بہتری کے لیے کیا ہوگا؟ قوم کی اخلاقی' ثقافتی اور انسانی ترقی کے لیے کیا کچھ کیا جائے گا؟ معاشی ترقی کے لیے کیا ہم اندھا دھند اسی شاہراہ پر بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے جس کا خواب ہمیں مغرب نے دکھایا ہے' اور اس کے دیے ہوئے پیمانے لے کر ہم قومی پیداوار' فی کس آمدنی' موٹروے کی لمبائی اور ٹیلی فونوں کی تعداد جیسے اعداد و شمار کے سراب سے اکیسویں صدی کی طرف اپنی پیش قدمی ناپتے رہیں گے؟ جبکہ امیر' امیر تر ہوتے رہیں گے اور غریب' غریب تر' تعلیم اور صحت کا بجٹ گرتا جائے گا اور اخلاقی و دینی ترقی کا آئیٹم بجٹ میں جگہ ہی نہ پائے گا' عام آدمی اسی طرح ذلیل رہے گا اور کسان اسی طرح خستہ حال' رشوت کا بازار اسی طرح گرم رہے گا اور پولیس کی چیرہ دستیاں اسی طرح برقرار؟

مستقبل کی جھلک ماضی کے آئینہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ داستان کئی دفعہ بیان کی جا چکی ہے' اب مزید دہرانے کی محتاج نہیں۔ ان باتوں میں یقیناً وزن ہے کہ ان کے گھرانے کو دینی تشخص حاصل ہے' انہوں نے صرف ہاتھ میں تسبیح نہیں لے لی ہے بلکہ واقعی زندگی میں دینی

شعائر کا احترام ہے۔ نفاذِ شریعت سے روگردانی سہی، لیکن احکامِ الٰہی کا کھلم کھلا انکار نہیں ہے۔ دینی احیا کی کوئی فکر نہ سہی، لیکن کم سے کم ان کی طرف سے بے دینی اور اباحت کی براہ راست سرپرستی نہیں (خواہ ان کے وزیر بدنام زمانہ میڈونا کو پاکستان لانے کے لیے بے چین رہے ہوں، اور ان کے وزرا اور اہلکار دنیا بھر میں دادِ عشرت دیتے پھرتے رہے ہوں)۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟

ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ ان کی دین سے جتنی کچھ وابستگی ہے وہ یا تو خاندانی ورثہ ہے، یا اقتدار کی خاطر۔ یہ شبہ اس لیے قوی ہو جاتا ہے کہ ۱۷ اپریل سے انھوں نے اسلام کا نام لینا ہی تقریباً ترک کر دیا ہے۔ وہ ییلو کیب اور روزگار کے لیے قرضوں کی اسکیموں کو بآسانی سود سے پاک کرسکتے تھے، لیکن نہیں کیا۔ اب بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہہ دیا ہے کہ میں اسلامی قوانین کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اب سماں کچھ میر کے اس شعر کا سا محسوس ہوتا ہے کہ۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اس لیے کہ کسی نے انھیں سمجھا دیا ہے کہ اسلام کا نام لینے سے خواہ مخواہ امریکہ ناراض ہوتا ہے (جس سے برسراقتدار آنا خطرہ میں پڑتا ہے)، جبکہ عوام کو اس کی چنداں حاجت نہیں ——— انھیں تو ییلو کیب، گرین چینل، فری کرنسی اور موٹروے جیسے لالی پاپ دے کر بھی مست رکھا جا سکتا ہے۔

مستقبل دیکھنا ہو تو کیا عقلمندوں کے لیے یہ اشارہ کافی نہیں؟

اگر ہمارا یہ شبہ صحیح ہے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اب تحریکِ اسلامی کا مقصد یہی رہ گیا ہے کہ وہ پہلے بڑی برائی کے مقابلہ میں چھوٹی برائی کو برسراقتدار لانے کی جدوجہد کرے، پھر جب وہ سارے وعدے وعید اٹھا کر ایک طرف رکھ دے، نفاذِ شریعت سے روگردانی کرے (بلکہ بعض لوگوں کی رائے میں شریعت کے نام پر کفرِ بواح کا ارتکاب کرے)، تعلیم اور میڈیا کو سیکولر اور خارجہ پالیسی کو امریکہ نواز عناصر کے حوالے کردے، تو اس کے خلاف محاذ کھول لے۔ پھر جب الیکشن آئیں، تو پھر پیپلزپارٹی کے خوف سے یہی عمل دوبارہ دہرائے؟

بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ملک کو معاشی ترقی سے ہمکنار کردیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے نصف صدی کے تجربہ کو دیکھتے ہوئے اس حسنِ ظن کا کوئی جواز

نہیں۔ وہ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ہر قسم کی ترقی خدا اور رسولؐ سے وفا پر منحصر ہے' وہ اس غلط فہمی کا شکار کیوں ہوں ؟ وہ کیوں اس فریب میں آئیں کہ امریکہ ان کا مخالف اس لیے ہوگیا کہ کہیں وہ پاکستان کو کوریا اور جاپان کا ہم پلہ نہ بنا دیں ؟ اگر یہ صحیح بھی ہو تو کیا اب کوریا اور جاپان بننا ہی ہمارا خواب رہ گیا ہے۔ یہ تو ہم ہندوستان کا حصہ رہتے ہوئے بھی بن سکتے تھے۔

ہم اھون البلیتین کو حکمتِ عملی کا ایک بڑا اہم اصول سمجھتے ہیں اور اس بارہ میں کسی افراط و تفریط کے قائل نہیں۔ کوئی حکمتِ عملی' بلکہ روزمرہ کی زندگی اس اصول کے بغیر نہیں چل سکتی۔ ہم یہ بالکل نہیں سمجھتے کہ اس اصول پر عمل سے ہماری انقلابیت پر کوئی ضرب پڑتی ہے۔ ان انتخابات میں بھی ہمیں' سمجھ بوجھ کے ساتھ' اس اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہر حالت میں اس پر عمل کوئی دینی فریضہ ہے۔ اس پر کب' کہاں اور کتنا عمل کیا جائے' اس کا تعین دینی مصالح ہی کر سکتے ہیں۔

پھر کیا کیا جائے؟

یہ طے کرنا تحریک کے مستند اداروں کا کام ہے۔ جن کا مقصدِ زندگی رضائے الٰہی اور غلبۂ دین ہے' جو اس مقصد کے لیے تحریک سے وابستہ ہوئے ہیں' جو یقین رکھتے ہیں کہ اس وابستگی کے ذریعہ جو کچھ وہ آخرت میں حاصل کریں گے وہی ان کی اصل متاع ہے' جو یہ شعور رکھتے ہیں کہ ان کو سوچنا بھی چاہیے' اپنی رائے بھی بنانا چاہیے' اپنی رائے کو پیش بھی کرنا چاہیے' لیکن اپنے زورِ زبان و قلم سے اپنی رائے کو مقدم رکھنے پر اصرار نہ کرنا چاہیے' وہ جانتے ہیں کہ جب تحریک کے مستند ادارے کوئی پالیسی طے کر دیں تو ان کے لیے صحیح روش کیا ہے۔

لیکن ہم چند باتیں سب کے غور و فکر کے لیے ضرور سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک پیپلزپارٹی کا تعلق ہے' چھوٹی اور بڑی برائی کی بات تو اپنی جگہ صحیح ہے' لیکن شرِکلی تو کوئی نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آج بیس سال کے بعد بھی' انتخابات پیپلزپارٹی اور اینٹی پیپلزپارٹی' پارٹی کے درمیان ہی ہو رہے ہیں' پیپلزپارٹی کا ووٹ بینک ۱۹۹۰ تک برقرار رہا ہے' اور آج بھی اگر اس کے مخالف متحد نہیں تو دلوں میں اس کے جیتنے کے خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ تحریک ایک وقتی خطرہ کو ٹال دینے' اور اس کی خاطر ایک چھوٹی برائی کو پروان چڑھانے کے لیے نہیں بنی تھی۔ ایک دو موقعوں پر ایسا کرنا پڑے تو الگ بات ہے' لیکن اگر بیس سال سے مسلسل یہی کر رہے ہیں تو پھر سب سے اہم بات سوچنے کی یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اگر اس

صورتِ حال کا علاج نہ ہوا تو کیا وہ مسلسل یہی کرتی رہے گی ؟ جبکہ انتخابات کو ہم نے زمامِ کار میں انقلابی تبدیلی کی خاطر اختیار کیا ہے' نہ کہ وقتی مسائل سے نپٹنے کے لیے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ جب تک پیپلزپارٹی خود ایشو (issue) بنی رہے گی وہ زندہ رہے گی۔ وہی انتخابی مہم کا مرکز بنی رہے گی' اسی پر توجہات مرکوز رہیں گی' اس کی قوت برقرار رہے گی۔ کیا یہ بات قابلِ غور نہیں کہ سارے انتخاب لڑنے والوں کا تشخص پیپلزپارٹی کے حوالے سے متعین ہو رہا ہے' کہ کون اس کے ساتھ ہے' کون اس کا مخالف ہے' اور کون اس کے جیتنے کا باعث بن رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک تحریک اور اس کی دعوت و پروگرام' یا کوئی دوسری قوت' خود ایشو نہ بن جائیں۔ خود اس کا' بلکہ دوسروں کا بھی' تشخص اس کے حوالہ (reference) سے اور اس کی زبان (terms) میں نہ ہو۔ یہ مقام کسی کا دست و بازو بن کر' کسی کا ضمیمہ بن کر ہرگز بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اپنے تشخص کے ساتھ کسی سے بھی حلیفانہ تعلقات میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہود کو بھی مدینہ کی ملتِ واحدہ کا حصہ بنایا گیا' مشرکین سے بھی حلیفانہ تعلقات استوار کیے گئے۔

اس مقصد کے لیے' اپنے اللہ پر اعتماد کی بنیاد پر' اپنے اوپر اعتماد بھی ناگزیر ہے۔ اعتماد کے معنی بعیداز حقیقت خواب دیکھنا نہیں' لیکن خواب دیکھے بغیر کوئی راہ معراج پر نہیں لے جاتی۔ جو دو اور دو چار کا حساب کرکے امروز و فردا کے چکر میں پھنسے رہنا ہی جانتے ہیں' وہ صرف بنیے کی دکان چلا سکتے ہیں۔ جو بڑے بڑے اور اونچے اونچے خواب دیکھنا جانتے ہیں' وہ آج پورے ہوں یا کل' یا نہ ہوں' وہی دنیا میں بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ذہنوں میں ایک دایاں بازو بنایا ہوا ہے۔ اور خود کو اس کی قیادت کے لیے نااہل تصور کرتے ہوئے اس کی فطری قیادت ان دوسروں کے سپرد کر دی ہے' جن کا تعلق تحریک کے مقاصد سے ایک تسمہ سے اٹکا ہوا ہے' آج ہے تو کل ٹوٹا۔ بعض لوگوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ تحریک کی منزل ۹۵۰ سال میں تو ہاتھ آ نہیں سکتی' اس لیے وعظ و تبلیغ اپنی جگہ' کارِ جہاں کی حد تک دوسروں کے پیچھے چلنا ہی مقدر ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک جو تحریک چاہتی ہے اس کے حقیقت بننے کا امکان جب صفر ہے' تو جو حقیقت کا نام لے اور اس سے دل لگائے رکھنے کی آزادی دے' اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے' اس کے دین سے محبت ہے' جو ایمان رکھتے ہیں کہ انصار اللہ کی محبت اس محبت کا تقاضا ہے' جو یقین رکھتے ہیں کہ "قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ" ان کو یہ سارے شیطانی وساوس مسترد کر دینا چاہئیں۔ اور وسوسوں کا

علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان پر توجہ ختم کر دی جائے' اور ساری توجہ اپنے مقصود یعنی اللہ پر' اور اپنی منزل یعنی غلبۂ دین کی طرف مرکوز کر دی جائے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام ۶:۷۹)

دریں حالات تحریک نے اپنی مستقل حکمتِ عملی کی طرف جو قدم اٹھایا ہے' اسی کو آگے بڑھانا چاہیے۔ انتخابات میں حصہ لے تو اسلامک فرنٹ لے۔ اسلامک فرنٹ اپنے قدم آگے بڑھانے کے لیے جہاں جس کو اپنا حلیف بنا سکے' اس کو اپنا حلیف بنائے۔ محاذ آرائی کم سے کم ہو' اپنے مثبت پیغام کو پہنچانے کی فکر زیادہ سے زیادہ ہو۔

اس حکمتِ عملی کو نتیجہ خیز ہونے کے لیے بہرحال وقت کی ضرورت تھی۔ موجودہ حالات میں جب دو بڑی متحارب قوتیں میدان میں نبرد آزما ہیں' ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمارے رائج طریقِ انتخاب کے تحت یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو۔ لیکن اپنی مستقل حکمتِ عملی کے مطابق اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اس پہلے مرحلہ میں صفر سیٹ بھی ان آٹھ سیٹوں سے بہتر ہوں گی جو دوسروں کا تابع ہونے کی صورت میں ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر بن گئی ہیں۔ اگرچہ ان سیٹوں کو برقرار رکھنے کی اور ان میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش ہماری ذمّہ داری ہے۔

وابستگانِ تحریک سے ہم یہی گزارش کریں گے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے تشخص اور اپنی دعوت و پروگرام کی بنیاد پر' اپنا سفر جاری رکھیں۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد ۴۷:۷)

دستورِ جماعت کی اہم بنیادیں

ان دستوری تجاویز میں اسلام کے شورائی نظام کے اصول' مزاج اور روح کو سمجھ کر اپنے نظامِ جماعت کی ضروریات پر ان کو منطبق کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے' اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ایک یہ کہ جن دستوری نکات کے بارے میں کوئی واضح نص موجود ہے' ان میں نص کی پوری پابندی کی جائے۔

دوسرے یہ کہ جن دستوری نکات کا کوئی قطعی فیصلہ نص میں نہیں کیا گیا ہے' ان میں متعدد مباح صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لی جائے جو ہمارے جماعتی نظام اور ہمارے موجودہ حالات کے لحاظ سے موزوں ترین ہو۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے' اس میں کوئی ردّوبدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ البتہ دوسری قسم کے معاملات میں تمام ارکانِ جماعت کو غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ تجاویز درست ہیں جو مجوزہ دستور میں درج کی گئی ہیں' یا وہ اپنے پاس ان سے بہتر کچھ تجاویز رکھتے ہیں۔

مثلاً یہ بات منصوص ہے کہ جماعتی زندگی میں تمام اہم معاملات کا فیصلہ مشورے سے کیا جائے۔ اس چیز کی پابندی پر ہم مجبور ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مجوزہ دستور میں اوپر سے نیچے تک نظامِ جماعت کے ہر درجے میں مشورے کو لازم کیا گیا ہے۔

لیکن مشورے کا کوئی تفصیلی ضابطہ منصوص نہیں ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں ممکن اور مباح ہیں۔ خلافتِ راشدہ میں جو صورتیں اختیار کی گئی تھیں وہ سب بھی منصوص نہ تھیں' بلکہ چند مباح صورتوں کو حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ ہمارے لیے بالکل جائز ہے کہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ہم کچھ دوسری صورت میں مباح صورتیں اختیار کر

لیں۔

خلافتِ راشدہ میں کچھ مخصوص اسباب کی وجہ سے اہلِ حل و عقد آپ سے آپ معلوم تھے۔ اس وقت ان کے انتخاب کی حاجت نہ تھی۔ اب ہم اپنی ضروریات کے لحاظ سے اہلِ شوریٰ کے انتخاب کا ایک ضابطہ تجویز کر سکتے ہیں۔ آپ اس ضابطے کے لیے نص نہ تلاش کریں' بلکہ یہ دیکھیں کہ بہت سی ممکن و مباح صورتوں میں سے جو صورت مسودے میں تجویز کی گئی ہے آیا وہی مناسب ہے یا آپ کی رائے میں کوئی دوسری صورت اس سے مناسب تر ہے؟

اسی طرح مجلسِ شوریٰ کے لیے جو آئینی طریقِ کار تجویز کیا گیا ہے اس کی بیش تر تفصیلات بھی مباحات کے قبیل سے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بجائے دوسری متبادل صورتیں مباحات میں سے سوچ سکتے ہیں۔ مگر کسی تجویز کو نہ اس بنا پر رد کر دیجیے کہ یہ طریقہ خلافتِ راشدہ میں رائج نہ تھا اور نہ کسی دوسری تجویز پر صرف اسی لیے اصرار کیجیے کہ یہی طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا۔ البتہ آپ کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے لیے ان مباح طریقوں میں سے کون سا طریقہ مناسب ہے جو اسلامی نظام کے شورائی مزاج سے قریب ترین مناسبت بھی رکھتا ہو اور ہمارے حالات و ضروریات کے لحاظ سے بھی موزوں ترین ہو۔

یا مثلاً امارت کے باب میں جو کچھ نص سے ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ایک امیر یا امام کے تحتِ امر ہونی چاہیے' اور اس کو زمامِ کار سونپنے کے بعد اس کی اطاعت فی المعروف ہونی چاہیے۔ نیز یہ اصول بھی نصوص کے اشارات اور صدرِ اوّل کے تعامل سے ثابت ہے کہ یہ صاحبِ امر جماعت کا معتمد علیہ ہونا چاہیے' اور اسے اسی وقت تک صاحبِ امر رہنا چاہیے جب تک اسے جماعت کا اعتماد حاصل رہے۔ ان اصولی باتوں میں ہم کوئی ردّوبدل نہیں کر سکتے۔

اب رہے یہ سوالات کہ امیرِ جماعت کا انتخاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ؟ طریقِ انتخاب کیا ہو ؟ انتخاب کسی مدت کے لیے ہو یا بلاتعیینِ مدت ؟ امیر کو کن حالات میں معزول کیا جا سکتا ہے اور اس کا ضابطہ کیا ہے ؟ امیر اور شوریٰ میں اختلافات کی مختلف ممکن صورتوں کا کیا حل ہے ؟ جماعت کا اعتماد کھو دینے کی صورت میں امیر اور مجلسِ شوریٰ' دونوں میں سے ہر ایک کو کیا کرنا چاہیے ؟ اور امیر کے اختیارات کن حدود سے محدود ہونے چاہئیں ؟ یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے دستوری سوالات ان امور میں سے ہیں جن میں شریعت نے ہم کو کسی ایک طریقِ کار کا پابند نہیں کر دیا ہے۔ اس لیے ہم بہت سی مباح صورتوں میں سے کسی ایک کو اپنے حالات و ضروریات کے

لیے موزوں ترین دیکھ کر اختیار کر سکتے ہیں۔ رفقاءِ جماعت کو چاہیے کہ اسی نقطۂ نظر سے ان سوالات کے جوابات مجوزہ دستور میں تلاش کریں اور ان پر غور کر کے رائے قائم کریں کہ آیا کسی کا اس سے بہتر جواب ان کی نگاہ میں ہے؟

مجوزہ دستور پر غور کرتے وقت رفقاء کو تین چار باتیں اور بھی ذہن میں رکھنی چاہیں:

اوّل یہ کہ جماعت کے ارکان اور کارکنوں کا جو اخلاقی معیار اس وقت ہے، صرف اسی کو سامنے رکھ کر نہ سوچیں، بلکہ ایسے حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جب کہ خدانخواستہ اس معیار میں کچھ تنزل رونما ہو جائے۔ اس امکان کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کرنا چاہیے کہ جو احتیاطی تدابیر اس دستور میں تجویز کی گئی ہیں وہ کس حد تک کافی اور مناسب ہیں۔ امکانات کا یہ پہلو نگاہ میں نہ رہنے سے اندیشہ ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو متعدد احتیاطی تدابیر جماعت کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ضروری محسوس ہوں گی۔

دوم یہ کہ "طریقِ کار" کے عنوان سے جماعت کی جس پالیسی کو مجوزہ دستور میں واضح کیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ اصولاً صرف ان حالات سے تعلق رکھتا ہے جب کہ ملک کے سیاسی نظام میں جمہوری طریقوں سے کام کرنا کسی درجہ میں بھی ممکن ہو۔ ان حالات کے بدل جانے کی صورت میں طریقِ کار کے متعدد اجزاء پر نظرثانی کی جا سکتی ہے، مگر اس کی فی الوقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوم یہ کہ اس جماعت کی حیثیت بعینہٖ "اُمّت" کی سی نہیں ہے۔ بلکہ امّت کے اندر ایک ایسی جماعت کی سی ہے جو فریضۂ اقامتِ دین سے امّت کی عام غفلت کو دیکھ کر اس لیے منظم کی گئی ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے خود کوشش کرے، اور بتدریج پوری امت کو اپنی اس کوشش میں شریک کر لے۔ اسی بنا پر رکنیت کی شرطیں، ارکان کے فرائض، ارکان کے حقوق، اور جماعت سے ارکان کی علیحدگی کے بارے میں آپ کو متعدد ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو "رکنِ جماعتِ اسلامی" اور "فردِ ملت" کی حیثیتوں کو خلط ملط کر دینے کی صورت میں وجۂ پریشانی بن سکتی ہیں۔ لہٰذا اس اختلاطِ حیثیات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

چہارم یہ کہ اس جماعت کے اصول اور مزاج کو دنیا کی دوسری جماعتوں کے اصول اور مزاج سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اس لیے اس کے دستوری خاکے پر غور کرتے ہوئے دوسری جماعتوں کے دستوری طریقے آپ بھول ہی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر ان کی نظیریں آپ کے ذہن میں

بقیہ بر صفحہ ۳۸

اغیار کا اعتراف

علامہ راشد الخیری

اغیار کا اعتراف

صرف مسلمان ہی نہیں ہر انسان نگاہ بلند کرے اور سامنے دیکھے۔ موسوی عہد گزر چکا ' مسیحی دور ختم ہوا ' نبوت و رسالت کے جلوے اپنے اپنے رنگ دکھا کر فنا ہوئے ' اور وہ وقت آ گیا کہ آمنہؓ کے لالؐ کی رسالت کا نقارہ بجے۔ اعلان نبوت کوس لِمَنِ المُلک کی طرح دنیا میں گونج رہا ہے۔ آسمانی کتابوں کے ماہر' تلاش کے قدموں سے آگے بڑھ رہے ہیں ' اور تحقیق کی آنکھیں یتیم عبداللہ کے گھر مکّہ کا طواف کر رہی ہیں۔ آفتاب نصف النّہار پر ہے اور عرب کی قیامت خیز گرمی نے آفت برپا کر رکھی ہے۔ یروشلم کے دو یہودی توریت و زبور کے عالم ' جن کے دلوں کو آیاتِ ربّانی نے تعصب و کدورت سے صاف کیا تھا ' مکّہ کی سرزمین پر داخل ہوئے ' اور اپنے ایک ہم مشرب و ہم مذہب یہودی بقّال کی دوکان پر ٹھہر کر کہا :

وہ شخص جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کہاں ہے ؟

میزبان بقال اپنے مہمانوں کے شوق کا استقبال بلند قہقہہ کی صدا میں کر رہا تھا ' کہ غل شور کی آواز کان میں آئی ' اور اجنبی سیاحوں کی آنکھوں نے دیکھا کہ آدمیوں کا غول چیختا چلاتا ' ہوہا کرتا چلا آ رہا ہے۔ چشمِ زدن میں مجمع سر پر آ پہنچا تو معلوم ہوا سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا ایک انسان بیچ میں ہے ' جس کے قدموں کو نبوت اور رسالت چوم رہی ہے۔ سر سے خون کے فوارے جاری ہیں ' لڑکے اور بچے ' بڈھے اور جوان چاروں طرف سے اس کے اوپر پتھر برسا رہے ہیں ' اور سرکنڈے مار رہے ہیں۔ یہودیوں کے دل تڑپ اٹھے ' ہمدردی کا جذبہ بلند ہوا ' اضطراب کی لہریں چہروں پر دوڑنے لگیں ' اور مکہ والوں کے ان مظالم پر لعنت کی بوچھاڑ کرتے ہوئے اٹھے ' تو بقّال نے کہا :

جس کی آرزو تم کو یہاں تک کھینچ کر لائی وہ محمدؐ یہی ہے۔

شوق حیرت سے بدلا اور تعجب کے آثار نمودار ہوئے' اور دل نے ' جس کی ہمدردی میں رحم شامل ہو چکا تھا ' فیصلہ کیا کہ آزمائش کا بہترین موقعہ ہے۔ یہ جگر خراش مظالم خالی جانے والے نہیں ' یہ خون رنگ لائے گا ' اور اگر دعویٰ سچا اور رسالت برحق ہے تو اس کی بددعا مکہ کیا عرب کا کلیجہ توڑ دے گی ' اور عذابِ الٰہی ان ظالموں کا ناس کر دے گا۔

یہودی مجمع کے ساتھ آگے بڑھے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک پتھر نے سرکار کی پیشانی زخمی کی اور خون کی تللی جاری ہوئی۔ دونوں اس لیے کہ نتیجہ کی آرزو گدگدا رہی تھی اور دل مظالم پر رو رہا تھا ' قریب پہنچ کر تھرا اور کانپ رہے تھے ' کہ ان کے سامنے ایک عجیب سماں آیا۔ عبداللہ کا یتیم ' جس کے حمایتی قبروں میں جا پہنچے تھے اور جس کا کوئی والی وارث نہ تھا ' ٹھٹھکا ' کمبل کے دامن سے پیشانی کا خون پونچھ کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے' اور کہا :

معبودِ حقیقی ! میری قوم کی غلطیوں کو معاف کیجیو۔ بے گناہ ہے۔ اس نے ابھی تک مجھ کو پہچانا نہیں۔

استعجاب کا خون رگوں میں بجلی کی طرح دوڑا ' اور عقیدت نے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ فضائے شوروشغب میں ایک متفقہ چیخ یہودیوں کی بلند ہوئی ' اور دونوں سر' یہ کہتے ہوئے قدموں میں گرے :

لاریب تو رسولِ برحق ہے۔

زندگی کے اس خوشنما دربار میں اس ظلم و ستم پر نفس کو مغلوب کرنا ایسا معجزہ ہے کہ جس کا جواب دینے میں عفووتحمل کے فرشتے خاموش ہیں۔ یہ رحم و کرم ' یہ ایثار و درگزر' عدیم النظیر ہے۔ جویائے حقیقت دریائے تاریخ میں لاکھ غوطے لگائے ' مگر یہ دُرِّشہوار میسر نہیں آتا ' اور عقلِ سلیم گردن جھکا کر صرف اتنا کہتی ہے :

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

توسنِ قلم میدانِ تاریخ کو طے کر لینے کے بعد بیانِ سیرت میں سجدے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے ' اور متعجب ہوتا ہے کہ کیسے دل اور کیسے انصاف تھے ان لوگوں کے ' جنھوں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر زندگی کی کش مکش نے ایمان نگلوا دیئے۔ جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ معمولی انسان نہیں پیغمبر ہے۔ مگر ایسے کینہ دوز اور سیاہ قلب تھے کہ دل کی حقیقت سے دماغ کو اور آنکھ کے تماشے سے زبان کو محروم رکھتے تھے۔

نضر کا اقرار

حجِ بیت اللہ کا وقت قریب ہے ' اور اس فکر نے قریش کی جان پر بنا دی ہے کہ لوگ دور دور سے آئیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے۔ جلسے ہو رہے ہیں ' مشورے کیے جا رہے ہیں ' اور تجویزیں سوچی جا رہی ہیں ' کہ کیا طریقہ اختیار کریں اور نووارد بھولے بھالے مسافروں کو کس جال میں پھنسائیں کہ منزلِ مقصود سے دور رہیں ' اور یہ بھنک کانوں میں نہ پڑے۔ وسیع پیمانہ پر ایک عام جلسہ سب سے کٹر دشمن نضر بن حارث کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ ان ملعونوں میں سے ایک ہے جو شب و روز قتل کے منصوبوں میں منہمک تھے۔ پتھر اس نے پھینکے ' گڑھے اس نے کھودے ' کانٹے اس نے بچھائے اور اوجھریاں اس نے ڈالیں۔ متفقہ تجویز ہوئی کہ زائرینِ بیت اللہ کے کانوں میں پہلے یہ بات ڈال دو اور یقین دلا دو کہ محمدؐ (نعوذباللہ) مجنون ہو گیا ہے' اور جھوٹا دعویٰ کرتا پھرتا ہے ' جب تجویز طے ہو چکی تو نضر نے کھڑے ہو کر کہا :

> بات وہ کرو کہ اپنے اوپر آنچ نہ آئے اور دنیا ہم کو نکو نہ بنائے۔ مکہ کی زمین پر آج تک کوئی شخص ایسا نہیں آیا جس کے کانوں نے تمھاری زبانوں سے محمدؐ کی تعریف نہ سنی ہو۔ تم نے ہمیشہ اس کی صداقت کا اقرار کیا اور سدا اس کی امانت کے گیت گائے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے بچہ سے جوان ہوا اور اب سر میں سفید بال ہمارے سامنے نمودار ہو گئے ' مگر ہم نے یا ہم میں سے کسی نے آج تک کسی معاملہ میں اس کی لغزش دیکھی نہ سنی کہ تل کا پہاڑ بنا کر اس کو بدنام کر سکیں۔ ابتدا سے انتہا تک ' اور روزِ پیدائش سے اس وقت تک ' کہ نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ' اس کی عمر میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ملتا جس پر حرف گیری ہو سکے اور لب کشائی کر سکیں۔ ہمارا یہ کہنا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے ' ہماری اپنی تذلیل و تضحیک ہے ' دنیا ہنسے گی اور لوگ مذاق اڑائیں گے اور مخلوق ہم کو مطعون کرے گی کہ کل تک جس منہ سے اس کی انسانیت کا کلمہ پڑھتے تھے آج اسی منہ سے اس کو جھوٹا کہتے ہو۔

نضر بن حارث دنیا سے اٹھ چکا ' اور اسلام کا وہ دور بھی ختم ہوا۔ مگر نضر کی تقریر اور حضور اکرمؐ کی صداقت و امانت کا یہ اقرار تاریخ میں چمک دمک رہا ہے ' اور بتا رہا ہے کہ اس سے بڑا معجزہ کیا ہوگا کہ اس دشمن کی زبان بھی جو ہر آزار کے درپے ' یہاں تک کہ قتل پر کمربستہ ہے ' اس طرح اعتراف کر رہی ہے کہ کیا دنیا کی کوئی تاریخ اور کوئی انسان اس کا ثبوت دے سکتا ہے کہ اس کی زندگی اغیار کی تاریخ میں اس طرح چمک رہی ہے ۔ الفاظ دشمنِ جانی کے ہیں اور

تعریف عدوئے ازلی کی۔

قریش کا بد بخت گروہ جو ہر صبح اس امید پر شام ' اور ہر شام اس توقع پر صبح کرتا ہے کہ آج جھگڑا ختم اور پاپ کٹ جائے گا ' جب ہر طرح سے ناکام اور ہر طرف سے مایوس ہوا تو بدرجہ مجبوری ابوطالب کے پاس پہنچا' اور کہا کہ اب اس کا فیصلہ کیجیے اور اپنے بھتیجے کو منع کیجیے کہ وہ ہمارے خداؤں کے خلاف کچھ نہ کہے ' اور توحید کو زبان پر نہ لائے۔ ابوطالب نے آپؐ کو بلا کر سامنے بٹھایا ' اور کہا کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں غور سے سنو۔ قریش بدستور کہتے رہے ' اور تقریر ان الفاظ پر ختم کی :

> اگر نکاح کا خواہش مند ہو تو قریش کی متمول سے متمول اور حسین سے حسین عورت ہم تیرے نکاح میں دیں ' اگر دولت کی آرزو ہو تو مال و متاع ' نقد جائداد ' زمین ' مویشی جس قدر کہے ابھی حاضر کر دیں۔

جب ابوطالب نے بھی اس گروہ کی تائید کی ' تو حضورؐ اکرم نے خیال فرمایا کہ چچا ' جس نے میری پرورش کی ' میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں ' تو جواب دیا :

> اگر قریش آسمان سے چاند اور سورج لا کر میری گود میں بٹھا دیں تو بھی میں خدا کے احکام نہیں چھوڑ سکتا ' عورت کیسی اور دولت کیسی ' ضرورت صرف صداقت کی ہے جس کی طرف میں بلا رہا ہوں۔

ہمدردی کی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں اور محبت سے لبریز دل تڑپتا ہوا بلبلاتا ہے' جب یہی دشمن مورخ اس پاک ذات کے متعلق جس نے زر و دولت کو ٹھکرا دیا ' عزت و اکرام کو لات مار دی ' ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ یہ واقعہ رحلت کے عرصہ دراز کا ہے کہ بی بی عائشہؓ ایک موقعہ پر کھانا کھا رہی تھیں اور آنکھ سے زاروقطار آنسو جاری تھے۔ ان سے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا :

> خدا کے رسولؐ اور میرے شوہر جن پر نبوت ختم ہوئی' دنیا سے رخصت ہوئے 'مگر مجھ کو دنیا نے اجازت نہ دی کہ کبھی ایک وقت کی روٹی چھنے ہوئے آٹے کی کھلا دیتی ' آج یہ صاف روٹی میرے حلق میں پھنس رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ زندہ ہوتے تو پہلے ان کو کھلاتی اور پھر خود کھاتی۔

انصاف آقائے نامدار کے قدم چومتا ہے ' عقل نثار ہوتی ہے ' اور ایمان بآوازِ بلند کہتا ہے:

درود تجھ پر شفیعِ محشر رسولؐ تو ہے ' حبیب تو ہے

باغیچۂ دہر میں صبح وشام انواع واقسام کے پھول کھلتے اور مرجھاتے جاتے ہیں ' مگر زمین کا وہ قطعہ جس کی آغوش کسی خاص پھول سے بسی ' مدتوں رستہ چلتوں کے دماغ معطر کر دیتا ہے۔ قندیلِ فلک ، ہر چودھویں تاریخ کو پردۂ دنیا پر تمام رات جگمگا کر صبح کو جھلملاتی جاتی ہے ' مگر بزمِ شب کا وہ سماں ان دماغوں سے پوچھنا چاہیے جن کے دلوں سے اس کی یاد موت کے سوا دوسری طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ مادرِ گیتی کے پیٹ سے لاتعداد انسان مرد اور عورت ظہور پذیر ہوئے ' مگر آمنہ کا لال اور خدیجہؓ کا شوہر وہ انسان تھا جس کے مقدس نام پر عقلِ سلیم بے ساختہ قربان ہوتی ہے۔

غیر کی گواہی

قیس بن سائب ' جو ایک دفعہ شریکِ تجارت تھا اور مسلمان بھی نہ ہوا تھا ' حالتِ کفر میں کہتا ہے :

میں نے محمدؐ سے بہتر شریک نہیں دیکھا ' جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا اور نہ بدنیتی کی۔

حضرت انسؓ جو بچپن سے دمِ واپسیں تک غلامی کی حیثیت سے خدمتِ اقدس میں حاضر رہے ' فرماتے ہیں :

مجھے کبھی کوئی ایسا کام نہ بتایا جس میں خود شریک نہ ہوئے ہوں یا میری طاقت سے زیادہ ہو ' اور کسی کام کے بگڑنے پر غصہ نہ فرمایا۔

یہ شان کسی معمولی انسان کیا کسی نبی یا پیغمبر کی بھی نہیں ہو سکتی۔ زمین و آسمان کی آنکھیں صفاتِ انسانی کا یہ مجموعہ صرف ایک ذات میں دیکھ چکیں ' اس سے پہلے اور اس کے بعد اللہ کا نام تھا اور رہے گا۔

خاتم النبیینؐ پر نبوت ہی ختم نہ تھی ' انسانیت بھی ختم تھی ' جوہرِ انسانیت چمک اور دمک گئے۔ اسی ایک ذات میں انسانیت کی تفسیر دکھا گئی اور بتا گئی ' وہی انسانی ہستی جس کے سامنے جلیل القدر شہنشاہ زمیں بوس ہوئے اور بڑے بڑے فرشتے جس کے دربار کے ادنیٰ غلام تھے۔

فاروقِ اعظمؓ جیسا بہادر ' جس کی خلافت نے ایک عالم میں اسلام کا ڈنکا بجا دیا ' جس کے نام سے دنیا تھراتی تھی ' دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ خون کا فوارہ جاری ہے اور چند ساعت کا مہمان ہے ۔ اس ساعتِ آخر میں اس کی خواہش ' اس کی آرزو ' اس کا ارمان صرف یہ ہے کہ جسدِ خاکی سرورِ عالمؐ کے قدموں میں دفن ہو۔ ہزار ہا درود اور لاکھوں سلام اس ذاتِ پاک پر جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ جیسی شخصیتیں پیدا کر گئی ' جن کے نام اعمال نامۂ حیات میں ہمیشہ زندہ

بقیہ بر صفحہ ۳۸

انک لعلیٰ خلق عظیم

ڈاکٹر آصف قدوائی

قرآن پاک، اسلام کے احکام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو تعلیمات انسانوں کو پہنچائی گئیں، ان کا مجموعہ ہے۔ بحیثیت ایک عملی پیغمبر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک درحقیقت قرآنِ پاک کی عملی تفسیر ہے۔

جو حکم آپؐ پر اتارا گیا، آپؐ نے خود اس کو کر کے بتایا۔ ایمان، توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، جہاد، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، صبر، شکر، ان کے علاوہ حسنِ عمل وحسنِ خلق کی باتیں، جس قدر آپؐ نے فرمائیں، ان کے لیے سب سے پہلے آپؐ نے اپنا ہی نمونہ پیش فرمایا۔ جو کچھ قرآن میں تھا، وہ سب مجسم ہو کر آپؐ کی زندگی میں نظر آیا۔ (سیّد سلیمان ندویؒ)

جامعیت اور عملیت

اسلامی اخلاقیات کی ایک خوبی جو اسے دوسرے مکاتیبِ اخلاق پر فوقیت دیتی ہے، اس کے معلم کا وہ عظیم الشان اسلوبِ تعلیم ہے، جس کی مثال تاریخ کو لاکھ کھنگالیے کہیں نہیں ملتی۔ آپؐ نے قول کے ساتھ عمل کو اتنے مکمل طریقہ پر ملا لیا تھا کہ آپؐ کی ذات مبارک قرآنِ مجید کی جیتی جاگتی، زندہ و تابندہ تفسیر بن گئی تھی۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ہم کو ایک بے مثال جامعیت ملتی ہے۔ آپؐ کی سیرت سے زندگی کے تمام پہلو ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی زندگی میں ظلم کے پہاڑ بھی ٹوٹے، مصیبتوں اور آزمائشوں کی آندھیاں بھی آئیں۔ ناکامیوں کا اندھیرا بھی چھایا، اور فتح مندی اور کامرانی کے شادیانے بھی بجے۔ قوت و حکومت کے پرچم بھی لہرائے اور مسرتوں کے پھول بھی کھلے۔ آپؐ نے دوستی بھی برت کر دکھائی اور دشمنی بھی، جنگیں بھی لڑیں اور صلح و آشتی کے عہد نامے بھی کیے۔ دن دن بھر روزے رکھے اور رات رات بھر نمازیں بھی پڑھیں، اور ملی اور سیاسی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ غارِ حرا میں خلوت نشین اور ماہِ رمضان میں معتکف بھی

رہے' اور خانگی زندگی کا لطف بھی اٹھایا۔ دینِ پاک کے سب سے بڑے مبلغ ' ھادی اور رہبر کا فرض بھی انجام دیا' اور مسلمانوں کی آزاد ریاست کی داغ بیل بھی ڈالی۔

نرمی اور سختی کے مواقع اور محل کو بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب پہچانتے تھے۔ جہاں حدودِ الٰہی کے ٹوٹنے کا سوال ہوتا تھا' وہاں آپؐ سختی کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے۔ اور جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل ہی سے تعلق ہوتا تھا' وہاں آپؐ نرمی سے کام لیتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا' مگر جو کوئی شریعت کی حد توڑتا تھا اسے سزا دیتے تھے۔

ایک بار قریش کی ایک خاتون چوری کے الزام میں پکڑی گئیں۔ بعض عزیزترین صحابہ نے ان کی سفارش کرنا چاہی' تو آپؐ نے ان کی نہ سنی' اور فرمایا : تم سے پہلے کی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی' اور جب بڑے لوگ کرتے تھے' تو ان کا جرم نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔اسی موقع پر یہ بھی فرمایا : خدا کی قسم اگر میری بیٹی بھی کبھی یہ جرم کرے تو میں اللہ کے قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔

اسی طرح نرمی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا۔ اتفاق سے اسے پیشاب کی حاجت ہوئی' تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ نے یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ مگر آپؐ نے روکا' اور فرمایا کہ تم سختی کے لیے نہیں' بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو۔ اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مساجد عبادت کے گھر ہیں' یہاں نماز پڑھی جاتی ہے' یہ پیشاب پاخانہ کی جگہ نہیں ہے۔ اور لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔

اپنوں کی گواہی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا' تو انہوں نے ساری داستان ایک جملہ میں کہہ دی۔ انہوں نے کہا :

> آپؐ کا اخلاق من و عن قرآن تھا۔

ایک اور موقع پر آپؓ نے ذرا تفصیل سے بتایا :

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا کہنے کی نہ تھی۔ آپؐ برائی کرنے والے کے ساتھ بھی برائی نہیں کرتے تھے بلکہ اسے معاف کر دیتے تھے۔ جب آپؐ کو کسی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو ان میں جو آسان ہوتی اسے اختیار کرتے تھے'

بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ کا شائبہ نہ ہو' کیونکہ گناہ سے آپؐ بہت دور رہتے تھے کبھی اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا' لیکن جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا اس سے خدا خود انتقام لیتا تھا' (یعنی احکامِ ربانی کے مطابق آپؐ اس کی سزا مقرر کرتے تھے)۔

آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ اور کسی غلام یا لونڈی یا کسی عورت یا خادم یا جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا' آپؐ کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے' بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔

آپؐ جب گھر تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔ دوستوں میں بھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ سکے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ آغازِ نبوت سے لے کر وفات تک برابر آپؐ کے ساتھ رہے تھے۔ ان سے حضرت امام حسینؓ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے کہا:

آپؐ خندہ جبیں و نرم خو تھے' سخت مزاج اور سنگدل نہ تھے۔ نہ شوروغل کرتے تھے' نہ کوئی برا کلمہ منہ سے نکالتے تھے' نہ عیب جو اور سخت گیر تھے۔ کوئی بات ناپسند ہوتی تو اغماض فرماتے تھے۔

آپؐ نے اپنے نفس سے یہ تین باتیں بالکل خارج کر دی تھیں: (۱) بحث و مباحثہ (۲) بے ضرورت باتیں کرنا (۳) بے مطلب کسی کی بات میں پڑنا۔

دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے: (۱) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (۲) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے (۳) کسی کی ٹوہ میں نہیں لگتے تھے۔

دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

نہایت فیاض' نہایت راست گو' نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعتہً سامنے آ جاتا تو مرعوب ہو جاتا تھا' لیکن جیسے جیسے آشنا ہو جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔ (شمائل ترمذیؒ)

ہند بن ابی ہالہ گویا آپؐ کی آغوش کے پروردہ تھے' انکا بیان ہے کہ:

آپؐ نرم خو تھے' سخت مزاج نہ تھے۔ کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے۔ کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے۔ کھانا جس قسم کا سامنے

آٹا تناول فرماتے تھے' اور اس کو برا نہ کہتے۔ اگر کوئی کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آ جاتا' مگر اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی آپؐ کو غصہ نہیں آیا نہ کسی سے انتقام لیا۔ (شمائل ترمذی)

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے کہتے ہیں :

میں نے دس برس تک آپؐ کی خدمت کی' مگر آپؐ نے کبھی کسی معاملہ میں باز پرس نہیں فرمائی۔ (مسلم)

مالک بن حویرثؓ جو بیس دن تک آپؐ کی صحبت میں رہے' کہتے ہیں کہ :

آپؐ رحم دل اور رقیق القلب تھے (بخاری)۔

حجتہ الاسلام امام غزالی "کیمیائے سعادت" میں تحریر فرماتے ہیں :

آپؐ مویشیوں کو خود چارہ ڈال دیتے' گھر میں جھاڑو دے لیتے' بکری دوہ لیتے' خادموں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے' انکے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے' بازار سے سودا خرید لاتے۔

ادنیٰ و اعلیٰ کو پہلے خود سلام کرتے' کوئی ساتھ ہو لیتا تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے' غلام و آقا' حبشی و ترک میں فرق نہ کرتے۔ رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے۔ کیسا ہی حقیر شخص دعوت دیتا فوراً قبول فرما لیتے۔ جو کھانا سامنے رکھ دیا جاتا رغبت سے کھا لیتے۔ رات کے کھانے سے صبح کے لیے اور صبح کے کھانے سے رات کے لیے اٹھا نہ رکھتے۔ نیک مزاج' نرم خو' کشادہ دل اور خندہ جبیں تھے' مگر زور سے نہیں ہنستے تھے۔ اندوہ گین تھے' مگر ترش رو نہ تھے۔ سخی تھے' مگر فضول خرچ نہ تھے۔

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے :

وہ کنبہ والوں اور خادموں پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ زبان مبارک پر کبھی کوئی گندی بات یا گالی نہیں آئی۔ کسی پر لعنت نہیں کرتے تھے۔ دوسروں کی ایذا رسانی پر صبر فرماتے تھے۔ کنبہ کی اصلاح اور قوم کی درستی پر بہت توجہ فرماتے تھے۔ ہر شخص اور ہر چیز کی قدرومنزلت سے آگاہ تھے۔ آسمانی بادشاہت پر ہمیشہ نظر جمائے رہتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

صحیح بخاری میں ہے :

آپؐ اطاعت شعاروں کو بشارت سنانے والے' گناہ گاروں کو ڈرانے والے اور بے

خبروں کو ہوشیار کرنے والے' خدا کے بندے اور رسول تھے' تمام معاملات اللہ پر چھوڑنے والے تھے۔ نہ درشت خو تھے' نہ سخت گو۔ بدی کے بدلے میں بدی نہ کرتے تھے۔ معافی مانگنے والوں کو معاف فرما دیتے تھے' اور گناہ گاروں کو بخش دیتے تھے۔ ان کا کام مذاہب کی کجیوں کو مٹانا تھا۔ ان کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان عطا کرتی تھی۔ آپؐ تمام خوبیوں سے آراستہ جامعِ اوصافِ حمیدہ تھے۔ سکینت ان کا لباس' نیکی ان کا شعار' تقویٰ ان کا ضمیر' حکمت ان کا کلام' عدل ان کی سیرت' راستی ان کی شریعت اور ہدایت ان کی رہنما تھی۔ آپؐ ذلت دور کرنے والے' گمناموں کو رفعت بخشنے والے' مجہولوں کو طاقت دینے والے' قلت کو کثرت اور تنگ دستی کو غنا سے بدلنے والے تھے۔

اغیار کی گواہی

مشہور انگریز ادیب' ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) نے لکھا ہے :

آپؐ کا گھربار معمولی اور کمتر لوگوں کے طرز کا تھا' اور آپؐ کی عام غذا جو کی روٹی اور پانی۔ اکثر آپؐ کے چولھے میں مہینوں آگ نہیں روشن ہوتی تھی۔ آپؐ کے سیرت نگار فخریہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ اپنے ہاتھ سے جوتے گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ کسی طرہ دار شہنشاہ کی اتنی اطاعت نہیں کی گئی جتنی کہ اس شخص کی' اس کے اپنے ہاتھ کی سی ہوئی عبا میں' ہوتی تھی۔

اور رومیوں کے انحطاط و زوال کا شہرۂ آفاق مورخ' ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) لکھتا ہے :

اپنی دنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمدؐ کی شرافتِ نفس نے شاہانہ تزک و احتشام روا نہ رکھا۔ خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ آگ روشن کرتا تھا' جھاڑو دیتا تھا' بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا' اور اپنے کمبل اور جوتوں کی خود مرمت کر لیا کرتا تھا۔ تارک الدنیا راہبوں کے مجاہدوں سے نفرت کرتے ہوئے آپؐ بلا تصنع و تکلف ایک عرب اور سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر آپؐ صحابہؓ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے مگر نجی زندگی میں آپؐ کے گھر میں ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔

فرانسیسی مورخ پروفیسر سیڈیو (Prof. Sedillot) نے اخلاق و عاداتِ نبویؐ کا ذکر کرتے'

ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے :

آپؐ خندہ رو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکرِ خدا کرنے والے، لغو اور بیہودہ باتوں سے نفرت کرنے والے، بہترین رائے رکھنے والے تھے ... آپؐ نہایت منصف مزاج تھے۔ مسکینوں سے محبت کرتے تھے، غریبوں میں رہ کر خوش ہوتے تھے، تنگ دست کو اس کی تنگ دستی کی وجہ سے نہ تو حقیر اور نہ بادشاہوں کو ان کی بادشاہت کی بنا پر برتر سمجھتے تھے۔

قرآن مجید کے انگریز مترجم اور مفسر مارماڈیوک پکتھال (Marma Duke Pickthall) نے یہ الفاظ لکھے ہیں :

عرب پر حکمران ہو جانے کے بعد بھی آپؐ اپنے پیروؤں سے برادرانہ انداز سے ملتے رہے، آپؐ کو نقیبوں اور پہرہ داروں کی ضرورت نہ تھی، اپنے لوگوں میں سادگی اور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے، ایک رہنما کی حیثیت سے، ایک مصلح کی حیثیت سے، اور ایک آزمائے ہوئے دوست کی حیثیت سے۔

جرمن مصنف گستاف وائل (Gustav Weil) نے لکھا ہے :

محمدؐ اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے۔ آپؐ کا کردار پاک اور بے داغ تھا۔ لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی۔ مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم و تکریم قبول نہیں فرماتے تھے، اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے۔ آئے دن آپؐ بازاروں میں سودا خریدتے، اور گھر میں کپڑوں میں پیوند لگاتے، اور بکری دوہتے نظر آتے تھے۔ ہر وقت ہر شخص کی آپؐ تک رسائی ہو سکتی تھی۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے، اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ آپؐ کی سخاوت اور خیر و خیرات کی کوئی حد نہ تھی باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپؐ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی آپؐ نے نہایت مختصر ترکہ چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو ہبہ فرما گئے تھے۔

اور واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) کا یہ بیان ہے :

اپنے انتہائی قوتِ اقتدار کے دور میں بھی، آپؐ نے وضع قطع، اور اخلاق و عادات میں وہی سادگی قائم رکھی جو پریشانی اور بے طاقتی کے زمانہ میں آپؐ کا وصف رہی تھی۔ شاہانہ کروفر تو بڑی بات ہے، اگر کسی مجلس میں آپؐ کے ساتھ کچھ خصوصیت کا برتاؤ

کیا جاتا تو وہ بھی آپؐ کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔

اس طرح کی شہادتیں اور بیانات کہاں تک نقل کیے جائیں ان کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

اخلاقِ عالی

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کا کچھ اندازہ ذیل کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے آیا۔ آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا "اگرچہ وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے مگر آنے دو۔" وہ آیا تو آپؐ نے نرمی سے گفتگو کی۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا اور اس کے واپس جانے کے بعد انہوں نے آپؐ سے دریافت کیا "آپؐ تو اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے پھر اتنی شگفتہ مزاجی سے کیوں باتیں کیں۔" آپؐ نے جواب دیا'

خدا کے نزدیک وہ آدمی سب سے برا ہے جس کی بدزبانی کے باعث لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔

اپنی غیر معمولی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ مدینہ میں آپؐ وقتاً "فوقتاً" یہودیوں سے قرض لیا کرتے تھے۔ اگر کبھی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو وہ سختی سے تقاضہ کرتے تھے۔ آپؐ ان کی بدمزاجی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک بدّو گوشت بیچ رہا تھا۔ آپؐ نے اس بھروسے پر کہ گھر میں کھجوریں رکھی ہیں' کچھ کھجوروں کے عوض میں گوشت چکا لیا۔ لیکن گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کھجوریں ختم ہو چکی ہیں چنانچہ آپؐ نے باہر آ کر بدو سے فرما دیا "اتفاق سے میرے یہاں اس وقت کھجوریں نہیں ہیں' تم اپنا گوشت واپس لے لو۔" اس نے شور کرنا شروع کر دیا "ہائے بددیانتی۔" صحابہؓ نے بہتیرا سمجھایا کہ "بھلا اللہ کے رسول بددیانتی کریں گے۔" مگر وہ نہ مانا' اور اپنی بات کہے گیا۔ صحابہؓ کو یہ برا لگا اور انہوں نے ڈانٹ کر اسے خاموش کرنا چاہا مگر آپؐ نے انہیں روک دیا "اسے کہنے دو' اس کا حق ہے۔" آخر آپؐ نے ایک انصاریہ کے یہاں سے کھجوریں منگوا کر گوشت کی قیمت ادا کی۔

آپؐ کی خدمت میں ایک بار ایک سائل حاضر ہوا' آپؐ نے اسے بٹھایا' پھر دوسرا' اور اس کے بعد تیسرا آیا۔ آپؐ نے ان سے بھی کہا "بیٹھو' میرے پاس تو اس وقت کچھ نہیں ہے؛ لیکن خدا دے گا تو تمہاری حاجت پوری کر دوں گا۔" اتنے میں کسی نے چار اوقیہ چاندی ہدیہ کی۔

آپؐ نے ایک ایک اوقیہ تینوں سائلوں میں تقسیم کر دی' اور چوتھی کی بابت اعلان کر دیا کہ جسے ضرورت ہو لے لے۔

مگر رات ہو گئی اور کوئی اس کا خواہش مند نہ ہوا۔ مجبوراً جب سونے کے لیے لیٹے تو اسے سرہانے رکھ لیا مگر نیند نہ آئی' بار بار اٹھتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ دیکھا تو انہیں تشویش ہوئی۔ انہوں نے پوچھ "کیا کچھ طبیعت ناساز ہے ؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں۔" انہوں نے کہا "پھر آپؐ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟" تو آپؐ نے سرہانے سے چاندی نکال کر دکھائی' اور فرمایا "اس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے اس حال میں موت نہ آ جائے کہ یہ چاندی میرے پاس ہو۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول پاکؐ نے ان سے فرمایا "ابوذر' اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تب بھی میں یہ نہ پسند کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھر بھی رہ جائے' علاوہ اس کے کہ جو میں ادائیگی قرض کے لیے چھوڑ دوں۔"

بعض اوقات ایسا بھی کرتے تھے کہ کسی سے کوئی چیز مول لیتے تو قیمت ادا کرنے کے بعد وہی چیز اسے بطور ہدیہ عنایت فرما دیتے۔

کھانے پینے کی معمولی سے معمولی چیز کو بھی تنہا نوش نہ فرماتے تھے' جو لوگ بروقت موجود ہوتے ان کو ضرور شریک کر لیتے تھے۔

ایک بار آپؐ کہیں جا رہے تھے کہ ایک حاجت مند نے سوال کیا۔ آپؐ اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے' لیکن اسے رخصت نہیں کیا بلکہ ساتھ چلنے کو کہا کہ شاید راستہ میں کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی ہمراہ تھے۔ انہوں نے عرض کیا "آپؐ خود خالی ہاتھ ہیں' تو آپؐ پر کیا ذمہ داری ہو سکتی ہے۔" ایک اور صحابی وہیں موجود تھے' انہوں نے کہا "یا رسول اللہؐ آپؐ دیے جایئے۔ خدا آپؐ کو محتاج نہیں کرے گا۔" یہ بات آپؐ کو بہت پسند آئی۔

آپؐ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ زہرہ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ تشریف لاتیں تو آپؐ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔ تاہم ان کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی' اپنے ہاتھ سے چکی پیستیں۔ اور خود ہی مشک میں پانی بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ان کا ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے' اور مشکیزہ اٹھاتے اٹھاتے شانہ پر نیل ابھر آئے تھے۔ ایک غزوہ میں کچھ کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں' تو انہیں خیال ہوا کہ اگر ایک

بقیہ بر صفحہ ۳۸

الدُّعاء

محمد تاثیر

نبی اکرمؐ کے ارشادات "الدّعاء مخ العبادۃ" اور "الدّعاء ھو العبادۃ" نہ صرف یہ کہ دعا کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں بلکہ دعا اور عبادت کی تعریفوں کو متعین کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہم لغوی اور اصطلاحی اعتبارات سے عبادت اور دعا کی تعریفوں اور ان کے باہمی ربط پر نظر ڈالیں تو عبادت اس' عبودۃ اور عبدیتہ سے ہے جس کے معنی خضوع اور تذلّل کے ہیں "گویا تابع اور رام ہو جانا۔ لسان العرب میں "العبد" کے معنی "المملوک خلاف الحر" کے ہیں --- گویا عبادت وہ غلامی ہے جس میں پرستش اور عقیدت بھی شامل ہو۔ اگر ہم دنیا میں عبادت کی عمومی ظاہری شکلوں کو دیکھیں گے تو بھی قیام ' دست بستگی اور رکوع بندگی (غلامی) کی علامات ہیں اور سجدہ ' طواف ' قربانی وغیرہ پرستش اور والہانہ پن کی غماز --- یہ علامات اصل میں عبادت کی ظاہری شکل ہیں جو نفس کے تابع فرمان اور معتقد ہونے کی نشانی ہے۔اصل عبادت تو عبادت کا باطن ہے جسے بالعموم اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے' جس کے اثرات کے تحت انسان کی ساری زندگی بندگی و پرستش میں بسر ہوتی ہے۔

دعا کے لغوی معنی پکار کے ہیں 'چاہے محض ایک پکار ہو یا حاجت روائی کے لیے سوال کی صورت میں ہو --- اصطلاحی اعتبار سے تو دعا' مانگنے کے معنوں ہی میں مستعمل ہے مگر مذہبی طور پر ہر وہ پکار جس میں بندہ اپنے رب سے براہِ راست ہمکلام ہوتا ہے' دعا کہلاتی ہے --- اس پکار کی وجوہات پر غور کیا جائے تو درحقیقت دعا بندے کا رب کے ساتھ براہِ راست رابطہ ' اس کے موجود ہونے پر یقین کا اظہار ' اس کی قدرت پر ایمان اور اپنے تابع اور مملوک ہونے کی علامت ہے اور یہی چیز روح عبادت ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے عبادت کی تعریف یوں کی ہے: ۲۔

ہر وہ چیز عبادت ہے جس کا حکم انبیاء (شرع شریف) نے دیا ہے۔ ان سے جو کچھ مطلوب ہے وہ انسان میں چار خصلتوں کی پرورش ہے'

۱۔ طہارت (باطنی و ظاہری)

۲۔ خضوع (دل کی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ)

۳۔ سماحت (دل کا بد خصلتوں کی بجائے نیک خصلتوں کی طرف مائل ہونا)

۴۔ عدالت (قیامِ دین ' حدود وغیرہ)

اگر ہم دعا کے اثرات کو دیکھیں تو اوّل الذکر دو خصائل تو بلاواسطہ دعا سے پیدا ہوتے ہیں اور باقی دو بالواسطہ دعا کا نتیجہ ہیں' خصوصاً احادیث میں دعا کی قبولیت کی شرائط میں باطنی پاکیزگی ' رزقِ حلال اور خضوع و خشوع کو بیان کیا گیا ہے۔

دعا اور عبادت کا یہی قریبی تعلق ہے جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے دعا سے اعراض کو عبادت سے اعراض اور تکبر سے تعبیر کیا ہے اور اس کی سزا جہنم بیان کی ہے'

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۳۔

(مجھ سے مانگو' میں دعا قبول کروں گا۔ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔)

قدیم صحائف ' مذہبی تواریخ اور آثارِ قدیمہ کے کتبوں کے محقق اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان کا ابتدائی مذہب توحید تھا اور اس کی اوّلین عبادات دعا اور قربانی تھیں۔ اس زمین پر انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں جب مظاہرِ فطرت اس کے لیے خطرہ اور تکلیف کی علامت تھے' انسان نے اپنی بقاء' اپنی اولاد کی سلامتی ' دشمنوں کے مقابلے میں دفاع اور رزق کے حصول کے لیے اپنے رب کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ گو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فطری سادگی میں کمی آتی گئی اور انسان نے شرک کی ابتدا کی مگر دعا تب بھی اس کی عبادت کا بنیادی جزو رہی۔

مصریوں ' بابلیوں ' اشوریوں کے قدیم کتبوں میں دعائیہ جملے ملتے ہیں۔ ہندوؤں کی ویدیں اس دور کا تحریری سرمایہ ہیں جب آریائی قومیں ۱۵۰۰ ق م میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ یہاں کے مقامی باشندوں سے انہیں جنگیں لڑنا پڑیں تو اپنی فتح اور دشمن کی بربادی کے لیے وہ دیوتاؤں کے سامنے دست بدعا نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ویدوں کا بیشتر حصہ دعاؤں پر مشتمل ہے'

"اے اندر ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا فرما۔ ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا فرما جو قوموں کو مغلوب کرے ... ہم کو دولت اور خوراک ' شریف اولاد کے ساتھ عطا فرما"۔ ۴

"اے اندر تو کہ اپنی طاقت کے لیے مشہور ہے' مضبوط ہے ' زبردست لڑنے والا ہے شہ زورو خونخوار ہے' ہر ایک کو زیر کرنے والا ہے "۔ ۵

بدھ مذہب گو ایسا مذہب ہے جس میں خدا کی ذات کا تصور ابتدائی طور پر موجود نہیں تھا۔ مگر جب گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا تو درخت انش کے نیچے بیٹھ کر بدھ نے جو فقرہ کہا وہ دعائیہ ہی ہے'

" اے کالبد خاکی کے بنانے والے جب تک میں نے تجھے نہ پایا مجھے بہت سی حیات الممات سے گزرنا پڑا ... مگر اب میں نے تجھے دیکھ لیا ہے"۔ ۶

انبیاء کی جو تعلیمات ہمیں قرآن پاک کے حوالے سے ملتی ہیں حضرت آدمؑ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک ہر نبی ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے دست بدعا نظر آتا ہے۔ انبیاء کی تعلیمات میں سے جو کتابیں آج دنیا میں موجود ہیں وہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں شامل کتب ہیں۔

توریت بنیادی طور پر قانون اور شریعت کے متعلقہ احکامات پر مشتمل ہے۔ آج ہمیں توریت میں روحانیت اور عبادت کے باطن کے حوالے سے بہت کم مواد ملتا ہے۔ اس لیے دعائیہ کلمات ان کتبِ خمسہ میں کم ہی ملتے ہیں تاہم بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ سے انسان کا براہِ راست کلام ملتا ہے جو ایک دعائیہ انداز ہے'

"اے خداوند تیرا دہنا ہاتھ قدرت کے سبب سے جلالی ہے ... تو اپنی عظمت کے زور پر مخالفوں کو تہ وبالا کرتا ہے "۔ ۷

بنی اسرائیل کے ہاں ظاہر پرستی اور قانون کی سختی کی جو لہر آئی بعد کے انبیاء نے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ لہٰذا عہد نامۂ قدیم کی دوسری کتب میں عبادت کے باطن کا ذکر بھی ملتا ہے اور دعائیہ کلمات بھی 'زبور تو قریباً تمام تر دعا ہے' اللہ کے بندے داؤدؑ کی پکار اور اللہ تعالیٰ کی یاد' جس میں بعض جگہ حاجت روائی کے لیے سوال کی صورت بھی ملتی ہے۔

حضرت داؤدؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک تصورِ باطن اور دعا کا ارتقاء عہد نامۂ قدیم میں واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ کتابِ نوحہ میں ایک بڑی عمدہ دعا درج ہے جس کا ابتدائی فقرہ فلسفۂ دعا کو سمجھنے میں بڑا اہم ہے۔

"ہم اپنے ہاتھوں کے ساتھ دلوں کو بھی خدا کے حضور دعا کے لیے اٹھائیں۔ اے خدا میں نے تہ زنداں تیرے نام کی دہائی دی' تو نے میری آواز سنی' میری آہ و فریاد سے اپنے کان بند نہ کر۔ اے خداوند تو نے میری مظلومی دیکھی' میرا انصاف کر۔ اے خداوند ان کو ان کے اعمال کے مطابق بدلہ دے"۔۸

حضرت مسیحؑ کی بعثت کا تو مقصد ہی یہود کو ان کی تنگ نظری' ظاہر پرستی اور اسباب پرستی سے نکال کر روحانیت کی راہ پر لانا تھا تاکہ اس امت میں توازن پیدا ہو۔ لٰہذا عہدنامۂ جدید اور مذہبِ عیسائیت میں دعا کی بڑی اہمیت نظر آتی ہے۔ پہاڑی کے وعظ کی دعا تو عیسائی مذہب کے ماننے والوں کی روزانہ کی عبادت ہے'

"اے باپ تو جو آسمانوں پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو"۔۹

حضرت عیسیٰؑ کے اقوال میں بھی ہمیں دعا کی بڑی تلقین ملتی ہے۔ آپؑ کا فرمان ہے'

"پس میں تم سے کہتا ہوں مانگو' تمہیں دیا جائے گا۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ' تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے اور وہ اسے پتھر دے یا مچھلی مانگے تو اسے سانپ دے"۔۱۰

حضرت عیسیٰؑ کی انھی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ کلیسوں کے نام خط میں پولس نے لکھا'

"دعا میں مشغول رہو اور شکرگزاروں کے ساتھ اس میں بیدار رہو"۔۱۱

عیسائیت میں یہاں سے اجتماعی دعا کا تصور پیدا ہونا شروع ہوا اور ہمہ وقت دعا مانگتے رہنا عبادت اور قابلِ تعریف قرار پایا۔ کتابِ اعمال میں ایک شخص کرنیلیس کی تعریف یوں درج ہے'

"وہ بہت خیرات دیتا تھا اور ہر وقت دعا کرتا رہتا تھا"۔۱۲

جب یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو نظرانداز کر دیا۔ اور مسیح کے ماننے والے افراط کی راہ پر چل نکلے۔ اہلِ مذہب کی گمراہیاں اور ان کی ذہنی درماندگیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو آخری پیغام قرآنِ حکیم کی صورت میں ملا۔ یہ وہ کامل ترین ہدایت تھی جس میں قانون کے احکامات بھی تھے اور ان کی روح بھی۔ اس کتاب کی ابتدا ایک دعا سے ہوئی ہے جو انسانوں کو تعلیم کی گئی اور جو امت کی ہر نماز کا لازمی جزو قرار پائی۔ دعا کے آغاز کے تین فقروں میں اس ہستی کا تصور اجاگر کیا گیا جس سے مانگا جا رہا ہے' اس کے تصور کے متعلق ساری انسانی غلط فہمیوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ آگے شرک کا ابطال اس درجہ پر کیا گیا

کہ تعریف ' عبادت اور استعانت کے لائق صرف وہی ذات قرار پائی۔ پھر اسی سے براہِ راست خطاب کر کے انسان نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بجائے ہدایت طلب کی۔ یہ دعا بار بار دہرائے جانے کے قابل قرار دی گئی تاکہ انسان کبھی دعا اور صراطِ مستقیم کی خواہش سے غافل نہ ہو۔

اسلام نے دعا کا جو فلسفہ عطا کیا ہے وہ انسانی ذہن پر کس کس طرح اثر انداز ہوا اس کا کامل احاطہ تو ممکن نہیں تاہم دعا کا اوّلین اثر تو شرک کے رد کی صورت میں ہوا۔ انسان نے شرک کی ابتدا ہی یوں کی کہ اس کے خیال میں ربِّ کائنات تک براہِ راست رسائی ممکن نہ تھی' یوں وسیلہ کا عقیدہ رواج پا گیا جو شرک کی انتہا تک جا پہنچا۔ اسلام نے اس کا رد کیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۱۳۔

(میں قبول کرتا ہوں ہر پکارنے والے کی پکار جب وہ مجھے پکارے)۔

شرک کے ابطال کے ساتھ ساتھ دعا اللہ تعالیٰ کے انتہائی قادر ہونے کا ثبوت ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے'

أُدْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۱۴۔

(مجھے پکارو میں قبول کروں گا)۔

پھر دعا کا عمل اللہ تعالیٰ کے نہایت قریب ہونے پر دلالت کرتا ہے جو انسانی زندگی کے رویوں پر شدّت سے اثرانداز ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا'

أُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۱۵۔

(پکارو اپنے رب کو تذلّل سے اور چپکے چپکے)۔

قرآنِ مجید کی محولہ بالا آیات نہ صرف یہ کہ دعا کی تحریک دلاتی ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ' ربوبیت ' رحمت اور قربت کا احساس انسان کو فراہم کرتی ہیں نیز دعا کی استجابت کا وعدہ انسان کو ہمہ وقت مانگنے پر اکساتا رہتا ہے' رسولِ اکرمؐ کا فرمان ہے'

"جس کے لیے دعا کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اس کے لیے استجابت کے کئی دروازے کھول دیئے جاتے ہیں" ۱۶۔

اگر ہم بنیادی دینی لٹریچر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دعا کے باطنی پہلوؤں اور فلسفۂ دعا کا مطالعہ کریں تو بھی ہمیں عملِ دعا کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

مقدمہ تاریخ میں ابنِ خلدون نے فصل "علم الکلام" کے ضمن میں بڑا عمدہ مضمون لکھا ہے

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات میں وجود پذیر ہونے والے حوادث کے اسباب ہوتے ہیں' اسباب بھی چونکہ حادث ہیں اس لیے ان کے لیے مزید سبب کی ضرورت ہوتی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ مسبّب الاسباب تک پہنچتا ہے۔ یہ اسباب ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ عقل ان کے احاطہ سے عاجز آ جاتی ہے۔ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ چونکہ یہ امور طبعی ہیں اس لیے عقل ان کا احاطہ کر سکتی ہے یا ان تک رسائی حاصل کر سکتی ہے تو بھی چونکہ فعل ارادہ پر مبنی ہوتا ہے اور ارادہ امور نفسانیہ سے ہے جن کا وجود سابق تصورات پر موقوف ہے۔ امورِ نفسانی اور ان کے مبادی کی ترتیب سے دنیا بے خبر ہے انسان کو زیادہ سے زیادہ رسائی امورِ طبعی تک ہو سکتی ہے۔ تصورات کا تعلق تو عقل سے ہے جو نفس سے بالا تر ہے اس لیے تصورات ان کا احاطہ تو ہرگز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ شریعت میں اسباب پر نظر نہ رکھنے کا حکم ہوا کیونکہ انسانی عقل اس صحرا میں کھو جائے گی اور کبھی حق تک نہ پہنچ سکے گی نیز اسباب پر نظر رکھنے سے انسان اسباب پرستی کا بندہ بن جاتا ہے یوں اسلام نے پسند کیا کہ ساری فکر اور توجہ ذاتِ حقیقی کی طرف پھیر دی جائے جو مسبّب الاسباب ہے --- اور تمام تکالیفِ شرعیہ کا مقصد اصل ملکۂ راسخہ کا حصول ہے جسے عقیدۂ ایمانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دعا اس عقیدۂ ایمانیہ کو راسخ کرتی ہے اور انسانی فکر کو اسباب کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دینے کے بجائے مسبّب الاسباب تک براہِ راست رسائی عطا کرتی ہے۔

قرآن اور اسلام نے دعا کو جو اہمیت دی اس کا صحیح ادراک بہت کم لوگوں کو ہو سکا۔ اسلامی فلسفہ میں اس موضوع پر زیادہ نہیں لکھا گیا۔ شاہ ولی اللہؒ جیسی عظیم علمی شخصیت نے جو اسلامی الٰہیات پر لکھنے والوں میں بہت بلند مقام رکھتی ہے' اپنی معرکہ آرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں جس کے ابواب میں اسلامی فلسفہ و عبادات کے قریباً ہر موضوع کو سمیٹ دیا گیا' دعا کے موضوع پر الگ باب نہیں باندھا۔

البتہ موجودہ دور میں اقبال نے دعا کی اہمیت کا بھرپور احساس کیا۔ باطن کی روح اور اپنی وحدت تک پہنچنے کے لیے دعا کی اہمیت کو اجاگر کیا' اقبال نے لکھا ہے'

"دعا خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی ' ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف اور تجسّس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالبِ حقیقت کے لیے نفئ ذات کا لمحہ ہی اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر

سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات میں سچ مچ ایک فعال عنصر کی ہے"۱۷۔

ایک اور جگہ اقبال نے لکھا ہے'

"مذہب کے عزائم 'فلسفہ سے بلند ہیں۔ فلسفہ عبارت ہے حقائق کے عقلی ادراک سے لٰہذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھتا جو ہمارے محسوسات و محرکات کی گوناگوں دنیاکو ایک نظام میں مدغم کردے۔ وہ گویا دور سے حقیقت کا مشاہدہ کراتا ہے اس کے برعکس مذہب قرب و اتصال کا خواہش مند ہے۔ یہ قرب واتصال تبھی ممکن ہے کہ فکر اپنی حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے جس میں اسے کامیابی ہو گی تو اس ذہنی روش کی بدولت' جسے اسلام نے دعا سے تعبیر کیا ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ کے لبوں پر تادمِ آخر قائم تھی"۱۸۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھنے سے قبل اقبال کے خطبہ "ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا" سے ان جملوں کو یہاں تحریر کر دیں جو دعا کے فلسفہ اور اس کے اثرات کو سمجھنے میں بڑے اہم ہیں'

"ہمارا جی چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اس کی موجودگی کا حقیقی تجربہ ہو۔ یہ تجربہ تبھی ہو گا جب ہمارا ذہن دعا کی روش اختیار کرے" —— ۱۹۔

"دعا ایک حیاتی عمل ہے جس کے ذریعے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری بے نام سی شخصیت کسی وسیع تر زندگی میں ہے" ۲۰۔

"گو دعا فکر ہے مگر فکر کی طرح آہستہ آہستہ حقیقت تک نہیں پہنچاتی بلکہ اس سے ذہن حقیقتِ مطلقہ پر تصرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور براہِ راست رسائی حاصل کرتا ہے۔ دعا گویا ان ذہنی سرگرمیوں کا لازمی تکملہ ہے جو فطرت کے علمی مشاہدے میں سرزد ہوتی ہیں" ۲۱۔

ان تحریروں کے مطالعہ سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ دعا ایک اعتبار سے انسان کو ربِ کائنات سے تقرب عطا کرتی ہے اور اسے کائنات کے رب کے وجود کا احساس عطا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے رابطے اور رسائی کے ذریعے وہ اپنی ذات کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اسباب کی دنیا سے بلند ہو جاتا ہے' تو دوسری طرف دعا انسان میں تصرف کی قوت پیدا کرتی ہے چونکہ دعا کا اسلوب گو دعا تذلّل بھی سکھاتی ہے' امر کا ہے جو آدمی کی شخصیت کو بلندی عطا کرتا ہے یہ بلندی اور ربِ کائنات سے یہ تقرب انسان کی نفسیاتی اور روحانی زندگی کو اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جسے

معراج کہتے ہیں جس کی نوید نبی اکرمؐ نے "الصلوٰۃ معراج المومنین" کے ذریعے دی ہے۔
یہ بات درست ہے کہ دوسری عبادات کی طرح دعا بھی بعض اوقات محض رسم کی شکل اختیار کر جاتی ہے لیکن دعا اپنی ساخت کے اعتبار سے وہ عبادت ہے جو بندے اور رب کے درمیان رابطے ہی کا نام ہے اور خلوصِ نیت سے اپنی گزارشات پیش کرنے کا نام ہے چند عربی عبارتیں پڑھنے کا نہیں۔ گو اجتماعی فوائد کے باعث اسلام نے فرض عبادات کو اجتماعی رنگ دیا مگر دعا کی ساخت کے پیش نظر نوافل تنہائی میں پڑھنا افضل قرار پایا ہے تاکہ بندہ مکمل خضوع سے اپنے رب سے ہمکلام ہو اور تقرب حاصل کرے جو اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ایک امریکی نفسیات دان پروفیسر ولیم جیمز نے لکھا ہے:

"جب تک دنیا کا سلسلہ قائم ہے دعا کا عمل جاری رہے گا سوائے اس کے کہ انسان کی ذہنی ساخت میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے کیونکہ دعا کی تحریک ہوتی ہے تو اس انسانی تصور کے باعث کہ ایک اعلیٰ و ارفع ہستی اسے دیکھ رہی ہے"۔

فلسفۂ دعا کے ضمن میں ایک بڑا مسئلہ دعا اور تقدیر کا تعلق ہے۔ مسئلہ تقدیر کو سمجھنے میں انسان نے بڑی فاش غلطیاں کی ہیں۔ دراصل مسئلہ تقدیر کے دو پہلو ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر نوعِ جنس کو محدود کیا گیا ہے یعنی ہر مخلوق کی کچھ حدود ہیں مثلاً پیدائش، موت، فطری تقاضے، ماحول، بقائے نسل، تکالیف وغیرہ جو نہ کسی دوسری مخلوق کے اختیار میں ہیں نہ انسان کے مگر انسان کو ان حدود میں رہتے ہوئے آزادیٔ رائے و عمل حاصل ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ربِ کائنات کے نزدیک زمانے کی کوئی قید نہیں اور اس نے اپنے علم کی بنیاد پر انسان کے سارے افعال کو پہلے سے جان لیا ہے اور یہی لوحِ محفوظ ہے جس کا انسان مجبور ہے۔ اس پہلو کو آج ایک مثال کے ذریعے سمجھنا آسان ہے۔ Time Machine کا تصور، گو ممکن نہ سہی، یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ انسان کے لیے مستقبل میں سفر کرنا ممکن ہے اور وہ مستقبل کی خبر لے کر اپنے زمانے میں واپس آ سکتا ہے۔ گویا جس کے پاس مستقبل کی یقینی خبر موجود ہے تو مستقبل کے وہ واقعات خود مختار ہوتے ہوئے بھی اس کے سامنے مجبور ہیں جس کے پاس ان افعال کی پیشگی خبر موجود ہے۔

قرآنِ مجید نے جو لفظ قدر استعمال کیا ہے اس میں مذکورہ بالا دونوں مفہوم موجود ہیں یعنی "اندازہ کرنا" اور "حدود متعین کرنا"۔ مفتی کفایت اللہؒ نے بچوں کے لیے اپنی کتاب میں تقدیر کی بڑی آسان اور بھرپور تعریف کی ہے:

"ہر بات اور اچھی اور بری چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک اندازہ مقرر ہے اور ہر چیز پیدا کرنے سے پہلے خدا اسے جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کے علم اور اندازے کو تقدیر کہتے ہیں" ۲۲۔

مسئلہ تقدیر پر اس بحث کے بعد ہم دعا کے ساتھ تقدیر کا تعلق دیکھیں تو ایک پہلو سے، جو اللہ تعالیٰ کے قبل از وقت علم کے متعلق ہے، دعا سے ٹکراؤ باقی نہیں رہتا یعنی جہاں اللہ تعالیٰ مستقبل کے علم سے واقف ہے وہاں ان دعاؤں سے بھی واقف ہے جو مستقبل میں مانگی جائیں گی۔ رہا دوسرا پہلو تو انسان کو ان دعاؤں کے مانگنے سے منع کیا گیا ہے جو ان عمومی اور معروف حدود کے خلاف ہوں جن میں انسان محدود ہے مثلاً زہر کھاکر نہ مرنے کی دعا یا پانی میں زندہ رہنے کی دعا وغیرہ چونکہ ایسی دعائیں فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہیں۔ باقی رہیں وہ خصوصی حدود جن میں انسان مقید ہے تو جان لینا چاہیے کہ یہ حدود ایسی چیز نہیں جنھوں نے ربِ کائنات کے ہاتھ باندھ رکھے ہوں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کہا ہے" تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ فلاں قسم کی علتوں سے فلاں قسم کے معلول پیدا ہونگے"۔ تو جب رسائی ہی علت العلل تک ہو تو انسان ان حدود سے آگے بڑھ سکتا ہے اور اس کا ثبوت ہمیں نبی اکرمؐ کے فرمان میں ملتا ہے کہ

"لا یرد القضاء الا الدعاء"

حوالہ جات

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا: قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

۲۔ جمعات (جمعہ ۱۷) جمعہ (جمعہ ۱۷)

۳۔ المومن (۴۰ : ۶۰)

۴۔ رگ وید ۱۱:۵۴ (بحوالہ الجہاد فی الاسلام از ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا)

۵۔ یجروید ۱:۳۷ (ایضاً)　　۶۔ ایضاً

۷۔ خروج (۱۳-۱۱ : ۱۵)　　۸۔ نوحہ ۴۴ : ۳

۹۔ متی ۱۵ : ۵　　۱۰۔ لوقا ۹ : ۱

۱۱۔ کلیسوں کے نام ۱ : ۴　　۱۲۔ اعمال ۱ : ۱۰

۱۳۔ البقرہ ۲ : ۱۸۶　　۱۴۔ المؤمن ۴۰ : ۶۰

۱۵۔ الاعراف ۷ : ۵۵　　۱۶۔ غنیۃ الطالبین

۱۷۔ اقبال، علامہ: تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

۱۸۔ ایضاً ۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ ایضاً ۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ کفایت اللہ مفتی : تعلیم الاسلام حصہ چہارم

بقیہ: انک لعلیٰ خلق عظیم

کنیز ان کی خدمت میں دے دی جائے تو ان کو اتنی محنت نہ کرنا پڑے۔ خود باپ سے کہنے کی تو ہمت نہ ہوئی، حضرت علیؓ کے ذریعہ سفارش کرائی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابھی اصحاب صفّہ کا انتظام نہیں ہو سکا ہے، جب تک یہ نہ ہو لے میں کسی اور کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

مسلمان، مشرک، کافر بھی آپؐ کے مہمان ہوا کرتے تھے، آپؐ ان کی یکساں تواضع اور مدارت فرماتے تھے۔ اکثر گھر میں جو کچھ ہوتا وہ مہمانوں کی نذر ہو جاتا اور اہل وعیال فاقہ سے رہتے۔ مہمانوں کے آرام کا اتنا خیال تھا کہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔

بقیہ: حکمت مودودیؒ

گھومتی رہیں گی تو قدم قدم پر آپ کو الجھنیں پیش آئیں گی۔ اسلام میں جمہوریت تو ضرور ہے، مگر یہ دوسروں کی مقلد جمہوریت نہیں ہے بلکہ اپنے اصول اور مزاج میں مستقل اور منفرد ہے۔

(ترجمان القرآن ج ۴۰، عدد ۵۰۴)

بقیہ: اغیار کا اعتراف

رہیں گے۔

کیسی مبارک تھیں وہ آنکھیں جنھوں نے اس جمالِ جہاں آرا کی زیارت کی، اور کس قدر خوش نصیب تھے وہ مرد اور عورتیں جو اس شمعِ رسالت پر قربان ہوئے، آگ کے شعلوں میں موت کی اذیتوں میں، تلواروں کی دھاروں میں، ان کے قدم نہ ڈگمگائے، اور سخت سے سخت اذیت و مصیبت بھی ان کی فریفتگی میں فرق نہ ڈال سکی۔

رسائل و مسائل

ولو کان بالصین

روایت "اطلبوا العلم فلو کان بالصین" کے بارے میں محدثین کی کیا رائے ہے؟ روایت صحیح ہے یا موضوع ہے؟ اگر صحیح ہے تو کس درجہ کی اور اگر موضوع ہے تو کس درجہ کی؟ امید ہے کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں گے۔

یہ حدیث موضوع ہے' اس کا راوی احمد بن عبداللہ بن خالد الجویباری ہے۔ ہرات کا ایک قصبہ جویبار یا جوبار ہے اس کی طرف یہ منسوب ہے۔ یہ شخص احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ "کان یضع الحدیث لابن کرام علی ما یرید ہ (ابن عدی) فکان ابن کرام یخرجہ فی کتبہ عنہ" اس کی سند یہ ہے کہ ابن کرام حدثنا احمد عن الفضل بن موسی عن محمد بن عمرو عن ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "اطلبو العلم ولو بالصین" (میزان الاعتدال ج ۱' ص ۱۰۶' ۱۰۷)

قال البیہقی متنہ مشہور اسنادہ ضعیف و قد روی من اوجہ کلھا ضعیفۃ وقال المزی لہ طرق ربما یصل عجموعھا الی الحسن (فیض القدیر ج ۱' ص ۵۴۲)

پس یہ حدیث موضوع ہے۔ بعض نے اسے ضعیف بھی قرار دیا ہے اور بعض نے حسن لیکن راجح یہی ہے کہ یہ موضوع ہے۔ جیسے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے رائے دی ہے کہ یہ شخص ابن کرام اور دوسرے لوگوں کو احادیث وضع کرکے دیتا تھا اور وہ اپنی کتابوں میں اسے ذکر کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

ویران مسجد کا انہدام

حالیہ سیلاب کے سلسلہ میں ایک مسئلہ درپیش ہے' وہ یہ کہ سیلاب کی بدولت ایک جامع مسجد مسمار ہوئی ہے۔ جس کا کچھ ملبہ اور اینٹیں باقی بچ گئی ہیں۔ سیلاب سے پہلے اس مسجد میں باجماعت نماز ہوتی رہی ہے۔ اس سیلاب کی بدولت آبادیاں دور' دور تک محفوظ مقامات پر چلی گئی ہیں۔ ایک دو افراد یا کوئی مسافر بعض اوقات اس مسجد میں نماز پڑھ لیتا ہے۔ امام مسجد اور دوسرے لوگ پریشان ہیں کہ آیا اس مسجد کو اسی جگہ دوبارہ تعمیر کیا جائے یا کسی دوسری جگہ آبادی میں منتقل کر دیا جائے۔ درج ذیل سوالات کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد گرامی ہے۔

۱۔ کیا اس مسجد کو اسی جگہ تعمیر کیا جائے جس جگہ پہلے تھی؟ لیکن باجماعت نماز ناممکن ہے۔

۲۔ کیا اس مسجد کا سامان' اینٹیں اور ملبہ کسی دوسری مسجد پر لگا سکتے ہیں؟

۳۔ اس مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے۔

متعدد علماء نے مشورہ دیا ہے کہ اس مسجد کو دوبارہ اسی جگہ تعمیر کیا جائے' یہی بہتر ہے۔ اس مسئلہ کا مکمل و مدلل حل تجویز فرمائیں۔

آبادی کا دوبارہ امکان ہو تو مسجد اسی جگہ تعمیر کریں لیکن اگر لوگ مستقل طور پر دوسری جگہ چلے گئے ہوں تو اس مسجد کو محفوظ کرلیجیے۔ یہ مسجد بھی رہے اور دوسری جگہ الگ مسجد بنا لیجیے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس قسم کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا "روایات بالا سے معلوم ہوا کہ اصل اور راجح تو عدم جواز نقل ہے لیکن بعض علماء ضرورت (اضطرار) میں جواز کے قائل ہوئے ہیں۔ سو بلا ضرورتِ شدیدہ تو اصل مذہب کو چھوڑنا جائز نہیں اور ضرورتِ شدیدہ میں گنجائش ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ایک مسجد مستغنی عنہ (بے نیاز) ہوجائے تو اس کا وقف دوسری مسجد میں صرف کرنا بھی جائز ہے"۔ (امداد الفتاویٰ ج دوم ص ۹۹ ـ ۶۹۸)

ضرورتِ شدیدہ اور مسجد سے بے نیازی کا مطلب یہ ہے کہ آبادی وہاں سے عارضی طور پر نہ گئی ہو بلکہ مستقلاً چلی گئی ہو اور دوبارہ وہاں آبادی کی توقع نہ ہو۔ چونکہ اس کا فیصلہ جلدی جلدی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں ضرورت ہو وہاں الگ سے مسجد بنا لی جائے اور موجودہ مسجد کو جس شکل میں ہے محفوظ کرلیا جائے۔ واللہ اعلم

جہیز کی مسنون صورت

مندرجہ ذیل امور کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح رہنمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

۱ - ہمارے ہادیٔ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیوں کو جہیز میں کیا دیا تھا۔

۲ - کیا بیٹی کے نکاح پر اعزہ سے تحائف وصول کرنا یا والدین کا اپنی بیٹی کو جہیز دینا جبکہ وہ اس کو وراثت میں بھی حصہ دیں' جائز ہے یا ناجائز ہے۔

۳ - ہمارے ایک دوست ہیں وہ جہیز دینے والے کو سورہ نساء کی ابتدائی آیات سے لیکر بالخصوص آیت نمبر ۱۴ (وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ... یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا) کی رو سے ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں۔ اس کی صراحت فرمائیں۔

۴ - ابدی جہنمی کون کون لوگ ہیں۔

آپ کے استفسار کا جواب یہ ہے کہ بیٹی کو گھر سے رخصت کرتے ہوئے کوئی چیز عطیہ کے طور پر دینا اچھی بات ہے۔ اس میں نمود و نمائش نہیں ہونی چاہیے اور اولاد میں سے دوسروں کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیے اور استطاعت سے زیادہ بھی نہیں دینا چاہیے جیسا آج کل رواج ہے۔ شریعت کا اصول ہے کہ مالک اپنے مال میں جائز تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اولاد پر خرچ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلۂ رحمی بھی۔ جب تک نصِ صریح سے ثابت نہ ہو کہ باپ اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت کچھ نہیں دے سکتا' اس وقت تک جہیز کے عدم جواز کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے اپنے دوست کے حوالہ سے سورہ نساء کی ابتدائی آیات خصوصاً آیت ۱۴ کا جو حوالہ دیا ہے وہ موضوع سے غیر متعلق ہے۔ جہاں تک حضرت فاطمہؓ کے جہیز کا تعلق ہے تو طبقات ابنِ سعد اور مسند احمد کی روایات کی روشنی میں حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے موقعہ پر آپؓ کو جو جہیز دیا گیا "وہ ایک چارپائی' ایک بڑی چادر' چمڑے کا تکیہ (جو کھجور کی چھال یا خوشبودار گھاس اذخر سے بھرا ہوا تھا۔ ایک مشکیزہ' دو گھڑے اور ایک آٹا پیسنے کی چکی پر مشتمل تھا۔" (مسند احمد ج ۱ ص ۱۵۴ مسنداتِ علی۔ طبقات ابنِ سعد ج ۸ ص ۱۴ ذکر سیدہ فاطمہؓ)

سورہ نساء کی مذکورہ آیات میں تو کفار کو جہنمی قرار دیا گیا ہے' اور ان لوگوں کو بھی جو اسلام کے نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔ آپ اپنے دوست کو سمجھائیں کہ بلا علم فتاویٰ جاری نہ کریں۔ واللہ اعلم۔

مطبوعات

عرفانستان : از قلم جناب حکیم محمد سعید ۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰۔
سفید اچھے کاغذ پر بہت نفیس کمپیوٹری طباعت، صفحات ۱۸۲، مضبوط جلد اور اس پر دلکش رنگین ڈیزائن ؛ قیمت یک صد روپیہ۔

زوالِ اقدار اور اضمحلالِ اخلاق کے اس تاریک دور میں جبکہ کہیں سے مردوں کے نالہ وشیون، کہیں سے عورتوں کی مہیب چیخیں اور کہیں سے ننھے منے لالوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں، خدا نے انسانیت کے ڈوبتے سفینے کو بچانے کے لیے جا بجا اپنے بندوں کو مامور کردیا ہے کہ وہ علم کی مشعلیں بھی ہر طرف روشن کردیں اور لوگوں کے دلوں کو جگمگا دیں، ساتھ ہی وہ سفینۂ انسانیت کے چپوؤں اور پتواروں کو سنبھالیں اور اسے امن و سکینت کی منزل کی طرف لے چلیں۔ ایسے پسندیدگانِ حق تعالیٰ میں حکیم محمد سعید کا مقام ہے۔ اب تک جو کچھ لکھا تھا وہی کب کم تھا کہ آج ان کی تازہ کتاب "عرفانستان" نیا سرمایۂ امید لے کر آئی ہے، اور ابھی پیچھے کتابوں کا قافلہ چلا آرہا ہے۔ ایک طرف ان کے قدم کی جادہ پیمائیاں اور دوسری طرف ان کے قلم کی کاغذی صحرا نوردیاں (دارالحکمت اور مریضوں کی خدمت وغیرہ الگ) تحیر افزا ہیں۔ نورستان کے بعد اب عرفانستان !

یہ کتاب رمضان المبارک سے منسوب اور منسلک ہے۔ رمضان قرآن کا خاص مہینہ ہے، یعنی اس میں قرآن پڑھا، سنا اور سمجھا بھی جاتا ہے اور حکیم صاحب نے بات مطالعۂ قرآن ہی سے چھیڑی ہے مگر جس مقطع تک پہنچائی ہے اسے پڑھ کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ ذرا دیکھیے :

یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کتاب سے تعلق تو ہمیں ویسا ہی ہو جیسا کہ ہم ظاہر کرتے ہیں، لیکن عملاً اس سے ہم اس قدر بے تعلق ہوں کہ یہ کتاب نہ تو ہمارے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہو، نہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، نہ اس کا کوئی گزر ہماری عدالتوں،

میں ہو، نہ دفتروں، گھروں اور بازاروں میں، حتیٰ کہ ہمارے دلوں میں بھی نہیں!

ہائے! یہ کلیجہ چھیدنے والے سات الفاظ! ---- کیا ہم واقعی اتنے گر گئے ہیں کہ خدا، رسولؐ اور قرآن کی باتیں بھی محض فیشن کے طور پر کرنے لگے ہیں، یا مخاطب خواص و عوام پر اپنی محبتِ دین کا رعب جمانے کے لیے؟ مگر حکیم صاحب نے قومی پیمانے پر جو حقیقت دیکھی اور محسوس کی، صاف صاف کہہ دی۔ کاش پتھروں میں بدلے ہوئے دل پھٹ جائیں اور ان سے نور کے دھارے پھوٹ بہیں۔ کاش کہ رواج یافتہ خوشنما منافقت اپنے چہرے سے ریشمیں ڈھاٹا کھول کر پرے پھینک دے اور اپنی آگ میں بھسم ہوجائے۔ مگر محترم حکیم صاحب! کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ آج نہ سہی، کل سہی۔

مندرجات کی تفصیل عرض کرنا تو مشکل ہے، لیکن موضوعاتِ ابواب سامنے آنے چاہئیں۔ (۱) حکمت و ہدایت (قرآن کی باتیں) (۲) عقاید و افکار (۳) انبیائے اولؑ و آخرؐ (۴) صحابہ کرامؓ (۵) شہادتِ حسینؓ۔ تفضلات رمضان (بشمول عید)۔ ان ابواب میں دین کی ساری ہی ابتدائی معلومات موجود ہیں، عقاید و عبادات بھی اور قرونِ اولیٰ کی تاریخ کے زریں ابواب بھی۔ ایک دو سطری بات سنیے:

> میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ساری علمی اور کلامی موشگافیاں دراصل ایمان کو دماغ کی راہ سے وارد کرنے کی کوششیں ہیں ... لیکن احساسات کے بندھن میں جکڑے ہوئے انسان کے لیے ایمان کی اس حلاوت کی ضرورت ہے جو اس کے دل پر اثرانداز ہو۔ (ص ۳۸)

(ن - ص)

میزانِ اقبال: از پروفیسر محمد منور۔ ناشر: اقبال اکیڈیمی پاکستان، ۱۳۹ - اے، نیو مسلم ٹاؤن لاہور۔ سفید کاغذ خاصا دبیز، کتابت طباعت عمدہ، جلد مضبوط۔ صفحات ۲۳۲۔ قیمت ۵۵ روپے۔ اشاعت دوم۔

کتاب کی بات تو بعد میں ہوگی، مگر اقبال اکیڈیمی کو یہ دفینہ کہاں سے ملا ہے کہ کتاب ویسی، اور قیمت ایسی۔ یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ جب مصنف یا اکیڈیمی پاس سے کچھ عطیہ بھی دے اور شائقِ کتاب سے کہے کہ بھائی ذرا غور و توجہ سے پڑھ لینا، صرف فیشن کے طور پر الماری میں نہ سجا لینا، جہاں پہلے بھی کتنی کتابوں کی لاشوں کو تم نے حنوط کرکے تابوت میں ڈال

رکھا ہوگا۔ ایک مصیبت اور بھی ہے کہ مونگ پھلی اور پالک اور صابن جیسی چیزوں کی قیمتیں تو "کے ٹو" کو فتح کرنے چل نکلی ہیں، اور کتاب کی قیمت اس رفتار سے گر رہی ہے جس سے خود حضرتِ انسان کی!

پاکستان بننے کے بعد میری نظر سے بس چند ہی کتابیں ایسی گزریں کہ محسوس ہوا کوئی دولتِ بے پایاں ہاتھ آ گئی۔ ایسا ہی تاثر پروفیسر منور مرزا بالقابہ کی کتاب میزانِ اقبال کا ہے۔ ہم بھی اپنے آپ کو بڑا "اقبالی مجرم" سمجھتے تھے، مگر پہلے بھی دو ایک اصحاب کی کتابوں نے ہماری سخت حوصلہ شکنی کی اور اب میزانِ اقبال نے بھی کہا کہ میاں! قدر خود بشناس۔ آپ کو معلوم ہے کہ کوئی برسوں کا لکھنے والا یوں کسی دوسرے کو مانا نہیں کرتا، مگر ہم درویشوں کی ریت الگ ہے، جہاں دوسرے درویش کو دیکھا اپنے قلم کی طرح سر، خم کردیا۔

حق یہ ہے کہ اقبال آسمان رس شاعر تھا، مگر اس کے ساتھ دوسری حقیقت یہ بھی تو گندھی ہوئی ہے کہ وہ علومِ مغربی و دینی کا ایک سمندر بھی تو تھا۔ اس کا ہر شعر اس کے بحرِ علم کا اچھالا ہوا ایک موتی ہے جس نے معلوم نہیں کن کن عربی و عجمی تصورات کی سیپوں میں پرورش پائی ہے۔ مگر ساری چمک دمک اس کی وہ ہے جو قرآن کے حسن آفریں مطالب و مقاصد خاص خاص موتیوں کو دیتے ہیں۔ اس کے کلام کے اجزاء کہیں شخصیتوں سے --- یونانی، ہندی، یورپی، عجمی، عربی --- تعلق رکھتے ہیں، کہیں اسلام کے ابھرنے کی تاریخ سے اور کہیں اسلام کے خلاف اٹھنے والے قدیم و جدید فتنہ ہائے فکر یا معرکہ ہائے خوں ریز کی تصویریں لیے ہوئے ہیں۔ لفظوں کی سطح کے اوپر کچھ کم، اور سطح کے نیچے بہت زیادہ۔ اور پروفیسر محمد منور مرزا کے ذہن کی بڑی بلند پروازیاں ہیں کہ انہوں نے اقبال کے ہاں عربی اثرات کی بھی خوب نشاندہی کی اور عجمیت کے اثرات کی بھی۔ ساتھ ہی مغرب کی فکر سے شعرِ اقبال کے جو ڈانڈے ملتے تھے ان کو بھی نہیں چھوڑا۔

یہ کتاب اتنا کچھ اپنے اندر رکھتی ہے کہ ترجمان القرآن کے محدود صفحاتِ تبصرہ میں تفصیل میں جانے کی گنجائش ہی نہیں، ان کی کتابیں تو تبصرہ طلب کتابوں کے ایک لمبے کیو کے آخر میں کھڑی تھیں۔ ممکن یہی تھا کہ اس مرتبہ ایک آدھ کتاب کا ذکر کردیا جائے۔

مختصراً بات اپنی پسند کی کہوں تو مجھے "توازن" والا باب پسند آیا۔ بات بھی نئی اور دینی حقائق کی ہلکی روشنی میں شعرِ اقبال میں اصولِ توازن کی کار فرمائی، نہایت دلچسپ گوشۂ مطالعہ و فکر نظر آئی۔

ان کے دوسرے موضوعات کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات' کلامِ اقبال میں عجم کا مفہوم' علامہ اقبال کی اردو غزل' علامہ اقبال کی نظم نگاری' علامہ اقبال جوش ملیح آبادی کی نظر میں' ابوالاثر بحضور اقبال' اقبال کا شعری آہنگ اور ضربِ کلیم اور آخر میں اشاریہ اعلام ---- رجال' مقامات' کتب و رسائل' اصلاحات۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم کا ذہن افروز مقدمہ اور مولف کی طرف سے ۶ صفحے کا حرفِ آغاز۔ میں انشاء اللہ اس کتاب پر زیادہ تفصیلی تبصرہ "سیّارہ" میں لکھوں گا۔

(ن - ص)

اسلام: مولفہ: مشہور صاحبِ علم و قلم شیخ علی طنطاوی۔ ترجمہ: از جناب مولانا سیّد شبیر احمد۔ ناشر: قرآن آسان تحریک ۱۳ - اے / ۲ ایجوکیشن ٹاؤن' وحدت روڈ لاہور۔ کتابت و طباعت مناسب' کاغذ اچھا نہیں' صفحات ۳۲۰ - سائز ۲۰ x ۳۰ کور دبیز کارڈ' سادہ و رنگین - قیمت ۴۰ روپے۔

شیخ علی طنطاوی کو دنیائے عرب میں خاص شہرت حاصل ہے' اور عرب سے باہر بھی اہلِ علم ان سے دلی تعلق رکھتے ہیں۔ طنطاوی صاحب نے ۵۰ برس میں ۴۰ مطبوعات مشتمل بہ گیارہ ہزار صفحات لکھیں۔ مزید گیارہ مسودات اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ شیخ نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے جو کام کیے ان کے پیچھے یہ سعادت کارفرما تھی کہ انہوں نے دینِ حق کا علم حاصل کرنے کے ساتھ وہ جدید علوم و مسائل بھی جان لیے جن کی جڑیں سرزمینِ باطل میں اتری ہوئی تھیں۔ مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے انہوں نے مختلف علما اور مفکرین کو توجہ دلائی کہ وہ اس نئے طاغوتی دور کے فتنوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو بہت سیدھے صاف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ مگر ایسی کوئی صورت جامہ عمل نہ پہن سکی۔

۱۹۳۶ء میں عربی ادب کے استاذ کی حیثیت سے بغداد کے مرکزی کالج میں طلبہ کو پڑھاتے ہوئے بالعموم یہ مطالبہ سامنے آنے لگا کہ ہمیں ایسی کتاب بتایئے جسے پڑھ کر ہم مغربی تعلیم کے زیرِ اثر اصحاب کو اسلام کے متعلق جواب دے سکیں۔ ۱۹۶۸ء میں اسی ضرورت کا ایک مقالہ مجلّہ "رابطہ اسلامی" میں شیخ طنطاوی کی طرف سے شائع ہوا۔ بہ عنوان "تعریف عام بدین الاسلام"۔ پھر چاروں طرف سے تقاضے ہونے پر دس دن میں عقاید و ایمانیات پر یہ کتاب لکھی اور مدینہ منورہ سے شائع ہوئی۔ اس کے ۱۲ ہزار نسخے تمام اساتذہ اور معلّمات میں تقسیم کیے گئے۔ پھر یہ اردن' بیروت وغیرہ سے شائع ہوئی۔ طنطاوی صاحب کی بڑی خواہش اس کتاب کے ۲ اور حصے

لکھنے کی تھی۔ مگر اس میدان میں قلم ایسا رکا کہ آگے نہ چلا بلکہ دوسرے نئے راستے اختیار کر لیے۔

اس کتاب میں مبادیاتِ اسلام میں سے ربِ واحد، رسالت، تقدیر، آخرت، وحی وغیرہ موضوعات پر کہیں مکالمے کے انداز سے گفتگو ہے، اور کہیں جدید عقلی اور سائنسی مسائل کو چھیڑ کر بات کی گئی ہے۔ لیکن ساری بحثوں میں عقل کی جولانیاں بھی دکھائی دیتی ہیں، اور یہ کتاب عقل کو ثانوی اہمیت سے آگے کوئی مقام نہیں دیتی۔

نہایت دلچسپ پیرائے میں بحثیں ہیں جنہیں فلسفہ کے گریجوایٹ طنطاوی نے اس طرح مرتب کیا ہے کہ انسان کی سوچ گھوم پھر کر اسلامی حقائق پر جا کر رکتی ہے۔

کتاب طلبہ کے لیے مفید۔ عام مسلمانوں اور اسلام سے ناواقف معلموں اور صحافیوں کے لیے بھی اہم۔

کتاب کے مترجم میرے جانے ہوئے بزرگ ہیں اور کئی سال ادارۂ معارفِ اسلامی میں کام کرتے رہے ہیں۔ عربی زبان میں خاصے بالغ نظر۔ انہوں نے بعض کتابوں کے تراجم کیے ہیں، بعض کی نظر ثانی کی ہے۔ اور اب قرآن تحریک کے اہتمام سے خدمتِ قرآن اور توسیعِ پیغامِ قرآن کا کام کر رہے ہیں۔ خدا انہیں نیک کاموں کی بیش از بیش توفیق دے۔

(ن - ص)

ذکری مسئلہ : تالیف : مولانا عبدالحق بلوچ، سابق ممبر قومی اسمبلی پاکستان۔ ناشر : دارالحدیث، تربت بلوچستان۔ ملنے کا پتہ : المنار بک سنٹر، منصورہ لاہور، پاکستان۔ سفید کاغذ اچھا، طباعت مناسب، کتابت معمولی، مضبوط جلد مع سادہ و رنگین گرد پوش۔ صفحات ۱۱۲ - قیمت ۳۰ روپے۔

بلوچستان میں، مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ سال میں دو ایک دفعہ فسادات کا دور دورہ ہوتا ہے خصوصاً رمضان شریف میں۔ روزہ داری، تراویح، اعتکاف اور تلاوتِ قرآن کے اس مہینے میں یہاں ساری توجہ ان تصادموں پر لگ جاتی ہے، جو کئی سال سے واقع ہو رہے ہیں۔ تربت کا مقام جہاں ذکریوں کا کوہِ مراد (مقامِ حج وغیرہ) واقع ہے، وہاں اکثر کرفیو لگ جاتا ہے۔ قیامِ امن کے لیے فورسز کی ڈیوٹیاں لگ جاتی تھیں۔ B.R.P اور دیگر فورسز کے دستے کئی شہروں میں طلب کر لیے جاتے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہوتا ہے جس کا اطلاق یک مشت یا اس سے بڑی داڑھی

اور عالمانہ وضع والے لوگوں پر بھی ہوتا ہے۔ ان کی نقل و حرکت ممنوع ہوتی ہے' استثنیٰ یہ کہ کوئی شخص مجسٹریٹ کے دستخطوں سے راہداری حاصل کر لے۔ ہر سال جانیں جاتی ہیں' گرفتاریاں ہوتی ہیں اور مقدمے چلتے ہیں۔

مولانا نے اس کتاب میں ذکریوں کے بارے میں معلومات مہیا کی ہیں' کیونکہ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں یہ لوگ ایک معما بنے ہوئے ہیں کہ آخر ذکر کرنا تو کوئی بری بات نہیں۔

اس گروہ کی تاسیس ملا محمد اٹکی نے کی جسے ان کے مرید' پیغمبر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ مانتے ہیں۔ ۹۷۷ھ اس کا سال ظہور ہے۔ اسے چونکہ نور مانا جاتا ہے اس لیے اس کے تولد یا ماں باپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس نے نماز کو منسوخ کر کے چند اوقات کے ذکر کو مقرر کیا۔ اس لیے یہ گروہ ذکری کہلایا۔

ذکری کہتے ہیں کہ اس کے نوری وجود نے دنیا سے کچھ کھایا پیا نہیں' بلکہ صرف جنت کی ایک نہر سے ایک من دودھ کا عمر بھر میں استعمال کیا اور جنت کے میووں اور کھانوں سے دس من استعمال کیا۔

ملّا محمد اٹکی کہتا ہے کہ میرے نور کا عکس کچھ فرشوں پر پڑا تو وہ ستر ہزار برس تک بے ہوش پڑے رہے۔ اس کے نور سے تمام اولیا مستفید ہوئے۔ ذکری دین بتاتا ہے کہ ملا محمد اٹکی کا نور خدا نے اپنے آپ سے پیدا کیا اور پھر باقی تمام انبیاء اور کائنات اسی نور سے پیدا ہوئی۔

ذکری دین کا کلمہ یہ ہے کہ۔ لا الہ الا اللہ ' نور پاک ' نور محمد مہدی رسول اللہ۔

ذکر اور سجدہ میں کسی متعین سمت کے قائل نہیں۔ سجدہ ایک ہی کرتے ہیں' دو نہیں۔ مال میں سے دہ یکی دینا طریقۂ امتِ محمدیہ ہے' لیکن نور مہدی پاک پر ایمان لانے کے لیے لازم ہے کہ مال کا ساتواں حصہ اساتذہ اور عالم فاضل لوگوں کو دے دے۔ جو شخص دینِ مہدی کی طریقت پر عمل کرتا ہو وہ ۱/۵ دے۔ یہ احکام تمام اموال کے لیے ہیں اور نصاب وغیرہ کوئی نہیں۔

کوہِ مراد نام کی پہاڑی ہے۔ جس کے ساتھ توابع کو ملانے سے ایک وسیع ادارہ بن جاتا ہے' مثلاً ملائے کوہ' گل ڈن' کوہِ امام' زم زم وغیرہ۔ بنیادی اہمت کوہِ مراد کی ہے جو مقامِ محمود بھی ہے۔ یہیں ایک دیوار میں خاص پتھر نصب ہے جسے حجرِ اسود کہتے ہیں۔

زمزم کے نام سے پرانی کاریزوں کا پانی ' اب خشک ہے۔ ذکری کہتے ہیں کہ گنہ گاروں کے یہاں نہانے کی وجہ سے پانی سوکھ گیا ہے۔ تفاصیل کتاب میں دیکھیے جس میں متعدد دوسری کتابوں کے نام ہیں اور ذکریوں کے اپنے لٹریچر کا بھی ذکر ہے۔

کہنا یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں خوارج سے لیکر 'حشیشین تک' اور قیدِ شریعت سے آزاد اہلِ طریقت سے لے کر قادیانیوں اور ذکریوں تک کیا عجیب سامانِ عبرت ہے۔ مذہب کے سوانگ رچانے اور ڈھونگ چلانے کے لیے ماہرین کو چند اہم نکات مل گئے ہیں' ان نکات کی بنا پر نت نئے فتنے لباسِ تقدس میں نمودار ہوتے ہیں۔ خوب جان و مال قربان کرتے ہیں' مگر خدا کے سچے سادہ دین سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ شیطان نے یہ حربہ نکالا کہ مذہب پسندوں کو نت نئے مذہب گھڑ کر دیے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی خدائی دعویٰ بھی کرے تو اس کو اپنے حصے کے بے وقوف مل جائیں گے۔ ہر بت انسانوں کی تمنائیں پوری کررہا ہے' ہر قبر کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے' بس اللہ میاں بیٹھے پکارتے رہیں کہ مجھ سے مانگو' میں دعائیں سنتا ہوں اور ان کے جواب دیتا ہوں (کارروائی کرتا ہوں) تمہاری حاجات پوری کرتا اور تم سے مصیبتوں کو دور کرتا ہوں' مگر تم میری آواز نہیں سنتے اور اپنی من مانیاں کرتے ہو۔ اچھا قیامت کے دن سب کچھ سامنے آجائے گا۔

(ن - ص)

تماشائی : مصنف ' م نسیم۔ ترتیب : ڈاکٹر سید عبدالباری و انتظار نعیم۔ ناشر: ادارہ ادبِ اسلامی ہند' ۲۴۴۸ بارہ دری شیر افگن ' بلیماراں' دہلی' ملنے کا پتہ : مرکزی مکتبہ اسلامی' بازار چتلی قبر' دہلی ۱۱۰۰۰۶۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ مجلد سادہ رنگین گرد پوش۔ قیمت ۵۰ روپے۔

کتاب حفیظ میرٹھی صاحب کے اس شعر سے منسوب کی گئی ہے۔

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کرلیا میں نے

سچ یہ ہے کہ کتاب ہمہ تن فریاد ہے۔ اولاً مصنف کے خلاف (شاید زیادہ قصور مرتبین کا ہو) جس نے اس کتاب کو مجموعہ بنا دیا افسانوں' پیروڈیز' ناولٹ اور دیگر تخلیقات کا' یعنی ادبی آچار کا مرتبان جس پر لیبل لگا ہوا کہ اندر کیا کیا کچھ ہے۔ دوسرے کتاب فریادی ہے اپنے دور کے ادب نوازوں کی کہ جن پر رحم کھا کر جناب مصنف نے ۱۹۶۰ میں چھپنے والی اس کتاب کو ۳۰ سال تک روکے رکھا۔ محبانِ فن کی نزاکت احساس کا اتنا لحاظ کہ کہیں ان کے حساس ذہنوں کے آبگینوں میں چھید نہ پڑ سکیں۔ بس یہی چیز م نسیم صاحب کے بے نیازانہ ادبی مرتبے کو واضح کرتی ہے۔ اگر انھیں ادیبوں اور قارئین کے نازک سے اعصابی ریشوں کے جھیر جھیر ہوجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ اتنی کتابیں لکھ چکے ہوتے کہ تماشائی کے بجائے تماشا بن جاتے۔ اور بچارے انتظار نعیم کا احساس

بالکل ہی دوسرا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اردو دنیا ایک عظیم فن کار کے جواہرپاروں سے محروم ہونے سے بچ گئی"۔ "سبحان اللہ! ارے بھائی دنیا جواہرپاروں کی فریفتہ نہیں ہے" اسے تو ادب میں ثقافتی پکوڑوں اور اجنبیت کے رس گلوں کا چسکا ہے۔

مصنف "سیلز گرل" میں جہاں کتنی ہی نامعقولیتوں کی طرف نہایت معقول انداز میں اثر انگیز اشارے کرتا ہے' وہاں اس کی جہاں بینی اور دیدہ وری بہت حیرت ناک ہے۔

مثلاً کہیں تو وہ غیر انسانی تمدن میں کسی ہوئی کسی شخصیت کے اندر سے اس کے فطری اور جبلّی تقاضوں کو ایک خاص تدریج کے ساتھ ابھار کر سامنے لے آتا ہے۔ جیسا کہ سیلز گرل کی دلچسپ کہانی میں ہے۔ یہ نفسیاتی عوامل کا جائزہ بھی ہے اور مادی تمدن اور فطرت کے پروردہ حقیقی انسان میں تصادم کا آئینہ دار بھی۔ کتنے ہی مرد اور کتنی ہی لڑکیاں ایسی ہوں گی جو اس تصادم کا عذاب بھگت رہی ہیں۔

دوسری بڑی اہم چیز جسے مقدمہ نگار حمید اللہ صدیقی صاحب نے ہماری کاوش کے لیے مخفی رہنے ہی نہیں دیا' وہ اردو مختصر افسانہ کے دفتروں کے مقابلے میں نہایت توجہ طلب مقام رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ م نسیم صاحب ماحول کا تماشا کرتے ہوئے ایسے سادہ اور عام سے افراد کو لے کر عظیم کردار بنا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے معمولی سے ظاہری پیرائے کے اندر نیکی اور خدمتِ انسانیت کی ایسی لمعہ افگن روشنی چھوٹی پڑتی ہے کہ ہم دم بخود رہ جاتے ہیں۔ معاملہ نورِ الٰہی کا لیجیے۔ اس کے تین لانچ چلتے ہیں۔ مگر اپنا رہن سہن معمولی ہے' بینک میں کوئی سرمایہ نہیں' وہ سودی لین دین کو حرام سمجھتا ہے۔ کوئی سمجھ نہیں پاتا کہ اس کی اتنی بڑی آمدنی کدھر جاتی ہے ---- نہ تاش' نہ جواء' نہ تماش بینی ---- عجیب راز ہے۔ جب وہ مرجاتا ہے تو قبرستان سے واپسی پر ملنے والی نوٹ بک کے اندر لکھے ہوئے کچھ نام پتے اور کچھ اعداد و رقوم' کچھ حدیثیں درج ہیں' تب اس کی پراسراریت اور بڑھ جاتی ہے۔ آخر اس کا ایک قریبی دوست یہ راز کھولتا ہے کہ نورالٰہی بیواؤں کی امداد اور غریب بچوں کی فیس وغیرہ ادا کرتا تھا۔ افسانہ ایک اعلیٰ مقصد رکھتا ہے' مگر بظاہر صرف افسانہ ہے۔ اور قاضی ہاؤس کے ادھنے والا قصہ جسے کوئی کسٹمر تپائی پر چھوڑ گیا ہے۔ ہر ایک اگر اس ادھنے کو دیکھتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ کئی دن بعد ایک بھنگی چار دن کی چھٹی کے بعد آتا ہے۔ اور جھاڑو دے کر ادھنہ اٹھا کر جیب میں ڈال لیتا ہے۔ خدا لگتی کہیے' کیا اثر ہوا آپ پر؟ تماشائی پیچھے پیچھے گیا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ باہر ایک اپاہج دکھائی دیا۔ خاکروب نے ایک ادھنہ اپنے پاس سے ڈالا اور دو ادھنے اپاہج کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اب سوچیے کہ وہ بھنگی کتنا بڑا

انسان تھا۔

یہی خوبی اور افسانوں میں بھی ہے' مگر ہر جگہ رنگ دوسرا ہے۔ مزید افسانوں کے علاوہ پیروڈیز' ڈرامہ' ناولٹ اور مزاح کے صفحات کا بھی یہ حال کہ ہر گوشہ بساط (م نسیم نے بساط خانہ بھی چلایا) "دامان باغبان و کف گل فروش ہے"۔ "فضل ربی" میں مزاح کی ایک نئی روش نکالی گئی ہے' لطف ہی آگیا۔

مگر بھئی! ہم تبصرہ نگار وغیرہ نہیں' بس کتابوں کا شائقین سے تعارف کرا دیتے ہیں۔ آگے کتاب جانے اور کتاب خواں۔

خلاصہ یہ کہ پچھلے ۵۰ سال سے بادۂ ادب میں جنسیت اور بے حیائی اور یاوہ گوئی کے جو زہریلے اجزا انسانی ذہنیت کو تباہ کرنے کے لیے داخل ہوتے رہے ہیں اب خدا کے فضل سے گھٹیا جنسیت کے" "لولی پاپ" (صحیح تلفظ مجھے نہیں معلوم) کو چوستے رہنے والے ادب و فن کے مقابلے میں ایک نیا ادب تیزی سے نشوونما پا رہا ہے جس کا ہدف تعمیرِ انسانیت اور بحالیٔ اقدار ہے۔ اس نئے محاذ کے ایک قابل ترین جنرل کا نام م نسیم ہے جو اپنے ادبی محاذ سے مفرور ہے۔ کتاب "تماشائی" کے چھپنے سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہمارے گم شدہ جنرل صاحب واپس آجائیں۔ کوئی کورٹ مارشل نہیں ہوگا۔ (ن - ص)

قرآنی ضوابط: از قلم پروفیسر احسان الحق چیمہ ایم اے ایل ایل بی' ناشر: ادارۂ معارف اسلامی' منصورہ لاہور۔ تقسیم کنندہ اور ملنے کا پتہ: المنار بک سنٹر' منصورہ' ملتان روڈ لاہور۔

احسان الحق چیمہ صاحب کی کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ خصوصاً ابتدائی اوراق کھولتے ہی ان کا مضمون کچھ اپنے بارے میں نظر پڑا۔ پھر لفظوں نے نظروں کو ایسا پکڑا اور پکڑ کر تاآخر نظروں کو رہائی ملی' مگر اب دماغ میں کھد بد ہونے لگی۔

اس طرح باب اوّل میں بطور مسلم کام کرنے کا ڈھنگ بتایا ہے' جس کا پہلا سبق یہ ہے کہ "اپنا طرزِ زندگی بدلیں۔" بس پھر پورے دس ابواب میں قرآنی ہدایات و تعلیمات کے ساتھ ساتھ اپنے دلچسپ تجربات و مشاہدات اور بزرگانِ سلف کی حکایات مل جل کر پڑھنے والے پر بڑا اثر کرتے ہیں' کیونکہ کہنے والے کا انداز پُرخلوص ہے۔ مختصراً اس کتاب میں چیمہ صاحب نے بڑی اچھی زبان میں (ماسوا اس کے کہ وہ "بیمار شیمار" لکھتے ہوئے اردو سے پھسل کر پنجابی میں چلے گئے

ہیں) اور بڑے خوبصورت اسلوب سے لکھی ہے اور اس میں غیر معمولی جاذبیت اور دلچسپی اوسط درجے کے تمام لوگوں' بالخصوص نوجوان طلبہ کے لیے ہے۔

یہ کتاب "برخیز" ("از ہندو عراق و عرب و ہمہ داں خیز") کا پیغام دیتی ہے کہ عملی جدوجہد پر ابھارتی ہے' یہ احتساب کو لازم ٹھہراتی ہے' یہ حیاتِ دنیا کو امتحان قرار دیتی ہے' اور علاوہ ازیں دین کے تمام بنیادی مسائل اور رواج باختہ مباحث پر قرآن سے روشنی ڈالتی ہے۔

اس کتاب کی داد یہی ہے کہ اسے خریدیئے اور پڑھیے۔

(ن - ص)

دل کے امراض : مصنفہ ڈاکٹر اقبال کاردار صاحب۔ ناشر: حیات جی پبلشر' چوک اردو بازار لاہور۔ کاغذ نیوزپرنٹ۔ صفحات ۲۵۶۔ گتے کی جلد سادہ رنگین ڈیزائن سے آراستہ۔ قیمت ۵۰ روپے' پیپر بیک ۳۲ روپے۔

بالفاظ مصنف: "دل در حقیقت ایک اعجاز آفریں مشین ہے' دنیائے عقل و شعور نے اسے حیرت انگیز عضو قرار دیا ہے --- ایک دن میں ایک لاکھ بار سے زیادہ ضربات کے ذریعے جسم کی ساٹھ ہزار لمبی شریانوں میں پانچ سے دس ٹن تک خون کو دھکیلتا ہے۔ ... اس کی قوت ۱/۶ ہارس پاور کے برابر ہے۔

دلچسپ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کا دل ہوتا ہی نہیں' یعنی کوئی اڑا لے جاتا ہے' کبھی یہ ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے اور کبھی کوئی شخص خوانچہ اٹھا کر صدا لگاتا ہے کہ "من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم"۔ دلچسپ یہ کہ ایسے ہی لوگ زیادہ تر ادھیڑ عمر میں شعبۂ امراضِ قلب میں داخل ہوتے ہیں اور جاں پر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

امراضِ قلب کے بڑھتے ہوئے واقعات کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اسے وبائے عصری قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ اپنے ساتھ بہت سے اسباب امراضِ قلب کے لایا ہے اور شاندار علاج بھی۔ پھر مفید اور مضر دونوں قسم کی غذاؤں' عادات اور عوامل کا بیان ہے۔ دل کے دورے سے اور اس کے طریقِ علاج سے ڈاکٹر صاحب نے قارئین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ہائی بلڈ پریشر کے بارے میں بھی معلومات دی ہیں۔ جس کا تعلق امراضِ قلب سے بہت ہے۔ ورزش کی اہمیت پر لکھا ہے۔ کولیسٹرول کی مضرت اور لہسن کی افادیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ یقیناً عوام کی رہنمائی کے لیے مختلف عام امراض کے بارے میں لٹریچر شائع ہونا چاہیے' بلکہ کاش

کہ اس کا انتظام ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے ذریعے ہو۔

ویسے ریڈیو' ٹیلی وژن' اخبارات اور دیگر لٹریچر اس انداز سے بھی عام نہیں کیا جانا چاہیے کہ ایک خوف اور ایک وہم سا لوگوں میں پھیلنے لگے اور حسّاس لوگ نفسیاتی طور پر واقعی مبتلائے مرض نہ ہو جائیں۔ میں نوعمری سے لے کر آج تک مرضِ دل کے حملے کا اندیشہ کرتا رہا ہوں۔ آخر معاملہ اپنی انجانا پر آپہنچا ہے جس کی وجہ وہم نہیں بلکہ عمر کے لحاظ سے کارکردگی اور حساس پن کی زیادتی ہے۔ اور جتنا آرام لیا جانا چاہیے' اس میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی۔ کیونکہ لکھنا پڑھنا ایک عادت نہیں' ایک ایسی لذت بن گیا ہے کہ اس سے نجات نہیں۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب کی کتاب بہت سے لوگوں کو حفاظتِ دل میں مدد دے گی۔ البتہ ایک ضروری چیز ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں جگہ نہ پا سکی۔ منفی جذبات اور گھٹیا خیالات تیز نفس پرستانہ خواہشات' دل پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔ منشیات کو بھی شامل کر لیں۔ اسی طرح اخلاقی لحاظ سے بے اصولی اور بے ضمیری کی زندگی گزارنا اور دوسروں کی خدمت یا ملک و ملت کی بھلائی کے لیے کوئی حصہ ادا نہ کرنا' یہ طرزِ حیات بھی دل پر بوجھ بڑھا دیتا ہے' کیونکہ بہت سے امورِ مسرت سے وہ محروم رہ جاتا ہے۔ ذکر و نماز Tensions کو روکتی ہے' اس وجہ سے دل کا ذریعۂ تحفظ ہے۔ ہمارے مسلمان ڈاکٹروں کو ایسے پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ (ن - ص)

انفاق فی سبیل اللہ: ابن عبدالشکور۔ ناشر: دعوت الاسلام سنٹر ۴ ایم' نمبر ۳ اسٹریٹ (نزد بیت المال شادی محل) چار مینار' مسجد روڈ کراس' شیوا جی نگر' بنگلور ۵۶۰۰۵۱۔ انڈیا۔

۹۶ صفحے کا یہ پمفلٹ سادہ و رنگین ورق کے ساتھ صرف آٹھ روپے میں ملتا ہے۔ اس میں ابن عبدالشکور صاحب نے انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق قرآن و حدیث سے اخذ کردہ مقدس کلمات کو نمایاں کیا ہے' آیاتِ قرآنی کی ترجمانی تفہیم القرآن کے مطابق کی گئی ہے۔

دولت اور معیارِ زندگی اور اسرافیات و تعصبات کے بتوں کی پوجا کے اس دور میں موضوعِ انفاق پر لکھنا ضروری تھا۔ زیادہ دولت کسی کے پاس آجائے تو یہ مقصد نہیں کہ وہ خوب کھلے دل سے اپنے مسائل و ضروریات پر اور تقریباً نمائش کاری پر صرف کرے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آخرت میں جواب ملے کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا۔ (الاحقاف ۴۶ : ۲۰) جائیے آپ لوگ بھی دنیا ہی میں اپنی ساری نعمتیں برت چکے۔ اب یہاں تو ذلت کا عذاب

ہے۔ ایک دولت کمانا ہوتا ہے دین کے لیے اور محتاج و مساکین کی مدد کے لیے' فلاحِ عامہ کی خدمات کے لیے' جہاد کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ اب مزے اڑانے کے لیے' اچھے پہناوے کے لیے اونچی عمارتیں بنانے کے لیے' صوفوں اور قالینوں سے کوٹھیاں سجانے کے لیے' اعلیٰ درجے کی سواریوں کے لیے' یہ میدان ایسا کھلا ہے کہ اس میں جدھر نظر ڈالو' ضرورتیں ہی ضرورتیں نظر آتی ہیں اور ان ضرورتوں کے لیے قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوگا۔ ۵۰ ہزار روپے ماہانہ آمدنی رکھنے والے نے اگر ۲ ہزار روپے راہِ خدا میں خرچ کردیے تو یہ محض اس لیے ہیں کہ اسرافیات و تعیشات کے ہنگاموں کو جاری رکھتے ہوئے کچھ تھوڑا سا نفاق ضمیر کو شور کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ دنیا کی دھوکے کی ٹٹی اور اس میں دولت کی لگی ہوئی خس کا کمال ہے کہ ہر طرف تڑپتے لوگوں' دین کی پامالی اور مسلمانوں کی' حتیٰ کہ پڑوسیوں کی خستہ حالی کے باوجود آدمی توند پر ہاتھ لے کر مزے سے ڈکار لیتا ہے' اور نئی نئی آمدنیوں اور نئے نئے مصارف کے لیے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ اپنی ایک دنیوی حیثیت کی حدود تو مستقلاً متعین کردیتا ہے' اس دائرے سے جو مال بچ رہے وہ اللہ کا ہوا۔

اس ذلیل حالت کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کی بڑی بھاری اہمیت ہے۔ انفاق' اسراف کا علاج ہے' انفاق دولت پرستی' عیش پرستی' دنیا پرستی اور معیار پرستی کا علاج ہے۔

اب آپ خود ابن عبدالشکور صاحب کی کتاب کے اندر مختلف چھوٹے چھوٹے ذیلی عنوانات کے تحت قرآن اور حدیث کے احکام کو پڑھیں۔ ان سے حاصل شدہ اسباق کو نوٹ کریں اور پھر زندگی میں آج ہی سے اس پر عمل شروع کردیں۔ خدا توفیق دے۔ (ن - ص)

آسان ترجمۂ قرآن کریم: مرتبہ: حافظ نذر احمد۔ مسلم اکادمی ۱۸ / ۲۹ محمد نگر' اقبال روڈ' لاہور۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب' سفید کاغذ' ہر پارہ دو رنگا' آرٹ کارڈ کی جلد میں۔ جملہ ۱۳۰۰ صفحات۔ ہدیہ ساڑھے سات روپیہ فی پارہ (اگرچہ لاگت فی پارہ ۹ روپیہ دس پیسہ آئی ہے اور تاجرانہ کمیشن اور طلبہ کے لیے خصوصی رعایت بھی ادارہ کے ذمے ہے)۔ پوری جلد کا ہدیہ اس کارِ خیر کے بعض معاونین کے تعاون کی بنا پر صرف ۶۵ روپے رکھا گیا ہے۔

حافظ نذر احمد صاحب کو پاکستان کے دینی حلقوں میں کون نہیں جانتا۔ وہ کئی سال سے عرصہ تاریخ میں ہیں اور یکے بعد دیگرے نئے نئے بھاری کام نکالتے رہتے ہیں اور پھر عزائم کے جو

خواب بناتے ہیں' انھیں پورا کر دکھاتے ہیں۔

حافظ صاحب بتاتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں یہ پہلا ترجمہ ہے کہ جو اہلِ سنت و الجماعت --- دیو بندی' بریلوی' اہلِ حدیث (تینوں مسالکِ فکر) کے علمائے کرام کا نظر ثانی شدہ اور سب کی سندِ قبولیت رکھتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن لفظی بھی ہے' سلیس بھی ہے۔ پہلی سطر میں قرآن کا متن جلی حروف میں ہے (فی صفحہ ۶ سطریں) دوسری سطر میں ہر لفظ جدا جدا خانے میں' اور تیسری سطر میں ہر لفظ کے نیچے اس کا اردو ترجمہ' پھر چوتھی سطر میں رواں ترجمہ۔ اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ ہر سطر کا ترجمہ اسی سطر (یا صفحہ) میں رہے۔ لفظی اور رواں ترجمہ میں کوئی خاص فرق نہیں۔

"آسان ترجمۂ قرآنِ کریم" کے کارِ عظیم کا آغاز ۳ دسمبر ۱۹۸۷ء کو بیت الحرام مکہ مکرمہ میں حافظ صاحب نے کیا۔ تکمیل ۳ دسمبر ۱۹۹۱ء کو مدینہ منورہ میں مسجدِ نبویؐ کے صفّہ پر ہوئی۔

آپ حیران ہونگے کہ پورے کلامِ مجید کی تکمیل سے پہلے ہی چار سال میں ایک لاکھ سے زیادہ پارے جمع ہو چکے ہیں۔ تا حال کسی ایک شخص نے بھی شکایت یا غلطی کی نشاندہی نہیں کی کہ یہ بات فلاں مسلک کی ہے اور فلاں کے خلاف۔

عمومی اشاعت کے علاوہ اس وقت تک ۱۳۰۵ افراد (طلبہ و طالبات) کسی استاد کے بغیر بذریعہ خط و کتابت آسان ترجمۂ قرآن کا درس لے چکے ہیں۔ ہر پارہ کا گھر بیٹھے امتحان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جیل خانہ جات میں ۱۷۰۸/ افراد پہلے ہی سے شریکِ تدریس ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ حافظ صاحب نے جس شرافت و انکسار کے ساتھ اب تک کئی سنجیدہ خدمات دین و علم انجام دی ہیں' اسی طرح ان کی یہ خدمت بھی اجر دارین کا باعث ہوگی۔

لوگ ان کے ترجمۂ قرآن کو حاصل کریں' پڑھیں اور لادینی و لغویات کے اس دور میں تعلیم و تعلم قرآن کو اپنے لیے مضبوط ڈھال بنائیں۔ کوئی گھر خالی نہ رہے جہاں قرآن پڑھا نہ جاتا ہو' کوئی مسجد ایسی نہ ہو کہ جہاں درسِ قرآن (غیر فرقہ وارانہ) کا دور دورہ نہ ہو' اور کوئی فرد' بوڑھا' نوجوان' خصوصاً بچہ ایسا نہ رہے کہ جسے قرآن پڑھایا نہ جا رہا ہو۔ قرآن اگر دلوں میں گھر کرلے تو پھر وہ عملی زندگی کو معصیت کی تاریکیوں سے نکال کر دینِ حق کی روشنی میں لاتا ہے۔ صرف قرآن کا طالب علم ہی جان سکتا ہے کہ کیسے کیسے طاغوتی اندھیرے کیسے کیسے روپ دھارے اس کے سرو سینہ پر لدے زندگی کو عذاب بنائے ہوئے ہیں۔ کاش کہ آپس میں لڑنے والے علما اور سیاسی لیڈروں کو ملحدانہ نظریات اور فاسقانہ کلچر کے اندھیروں کے وہ بھوت نظر آسکیں جو اتحاد

ملت اور عروج اسلام کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ (ن م)

اسلامیات : تالیف : سید طاہر رسول قادری۔ ناشر : ادارہ معارف اسلامی ۳۵ - D، بلاک ۲، فیڈرل بی ایریا، کراچی، کوڈ نمبر ۷۵۹۵۰۔ سفید کاغذ پر بہت اچھی کمپیوٹری طباعت۔ سرورق دبیز آرٹ پیپر، رنگین و سادہ۔ قیمت درج نہیں۔

میں نے اس کتاب کے تمام ابواب پر ایک نظر ڈال لی ہے۔ مجھے بعض خاص مسائل کے متعلق خیال تھا کہ ان میں کوئی بات الجھ جائے، مگر طاہر رسول قادری جیسے نستعلیق آدمی کے بارے میں ایسے ہر گمان کی تردید کتاب نے کردی۔ چونکہ یہ دینیات کا ایک کورس ہے جس پر درج ہے کہ "پاکستان بھر کے پروفیشنل کالجز کے نصاب کے مطابق" تو پھر ظاہر ہے کہ اصولی قسم کے مندرجات تبصرہ میں درج کرکے ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس ترتیب سے قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو مؤلف نے اختیار کی ہے۔ "اسلام کی بنیادیں" (توحید، رسالت، آخرت) "عبادات" (اسلام میں تصورِ عبادت ---- نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد)، "شریعت کے بنیادی ماخذ" (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس) "حصولِ علم کے ذرائع" (حواس، عقل، وجدان، وحی)، "اسلام کا فلسفہ اخلاق و معاشرت" (اسلام کا معیارِ اخلاق، پسندیدہ صفات، اسلام میں نیکی اور بدی کا تصور، کسبِ حلال)، "اسلام کا اصولِ سیاست" (اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات، مدینہ کی اسلامی ریاست، سربراہِ مملکت کی ذمہ داریاں، شہریت اور اس کی بنیادیں، اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق و فرائض) "اسلام کا نظامِ معیشت" (ملکیت اور تصرّف کا حق، تقسیمِ دولت، تقسیمِ دولت کی صورتیں، زکوٰۃ و عشر)، اختتامی باب : "اسلام ایک متحرک قوت۔"

اس سے مولف کے ذہن اور ترتیب مباحث کی معنویت واضح ہوجاتی ہے۔

مختصر پیش لفظ سہیل فاضل عثمانی اسسٹنٹ پروفیسر این ای ڈی یونیورسٹی کے قلم سے ہے۔ مؤلف نے ایک تمہیدی مضمون "اسلام کیا ہے" میں ایک جامع نظر ڈال کر اسلام کے بارے میں بعض مغالطوں کا ازالہ کیا ہے، اس کے دینِ فطرت ہونے اور اسلام اور ایمان میں فرق کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ سہیل فاضل عثمانی صاحب نے کتاب کی تحسین میں یہ اہم الفاظ لکھے ہیں :

> سچ تو یہ ہے کہ سالانہ طریقہ امتحان (Annual Exam System) کے تحت ایک ایسی کتاب کی ضرورت بھی تھی جو پورے کورس کی جملہ ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔ میری نظر میں کتابِ ہذا میں مذکورہ تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

کچھ کتابتی اغلاط نوٹ تو کیں مگر پھر خیال آیا کہ کمپیوٹر کی طباعت میں اس مصیبت کا حل بڑا مشکل ہے۔ لہٰذا معاف! (ن - ص)

تاریخی مضامین: از علامہ محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی۔ صفحات ۱۷۶۔ ناشر ادارۂ تحفظ ناموس اہل بیت پاکستان۔

میں نے نو عمری میں اخبار انجم کے ذریعے مولینا محمد عبدالشکور فاروقی کی تحریریں مسلسل پڑھیں۔ حافظے میں یہ اثر باقی ہے کہ زبان شائستہ ہوتی تھی اور دلائل قاطع۔ بڑی الجھن یہ ہے کہ ایک طرف ضرورت ترکِ نزاعات کی' دوسری طرف جارح فرقے بحثیں اٹھانے سے باز نہیں آتے۔ ایسے عالم میں مہذب پیرائے میں اگر مخالفِ اسلام نظریات کا جواب شائستگی سے بلا کسی تصادم انگیزی کے دیا جائے تو شاید اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ہاں بحث و اختلاف کے شریفانہ اصول طے ہونے چاہئیں' اور اختلافات کے باوجود بنیادی عقائد اور ملت کے مفاد سے متعلق امور میں متحد رہنا چاہیے۔ اس کے لیے علما کی ایک کونسل کی ضرورت ہے۔ (ن ۔ص)

نوٹ

اعلان کے مطابق تزئینِ نو کے بعد' ترجمان القرآن ۸۸ صفحات پر شائع ہونا تھا۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ۸۸ صفحات پر مشتمل ترجمان ستمبر کی بجائے نومبر ۱۹۹۳ سے شائع ہو گا۔ انشاء اللہ۔ جن احباب نے ستمبر ۱۹۹۳ سے سالانہ خریدار کی حیثیت سے مبلغ ایک سو روپے بھیجے ہیں' انہیں ستمبر ہی سے پرچہ بھیجا جارہا ہے۔ ان کی خریداری مدت ستمبر ۱۹۹۴ تک شمار ہوگی۔ (ادارہ)

اعتزار

اگست ۱۹۹۳ کے ترجمان القرآن میں رسائل و مسائل کے آخر پر غلطی سے ملک غلام علی کی بجائے ملک غلام نبی شائع ہوگیا۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ اس سہو پر ادارہ محترم ملک غلام علی صاحب سے معذرت خواہ ہے۔
(ادارہ)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE